فہرس

۱ قاضی کا انصاف ——— ۹

۲ مہاجر ——— ۳۱

۳ مساوات اسلامی ——— ۶۳

۴ حق کا فیصلہ ——— ۸۳

۵ مگر وہ حکمرانی جس کا سکّہ جان و دل پر تھا ——— ۱۰۱

۶ شہادتِ حسین ——— ۱۲۵

۷ امام رازی و چنگیز ——— ۱۵۹

۸ محمدؐ بن قاسم ——— ۱۸۵

۹ غزوۂ بدر ——— ۲۱۳

۱۰ ملتان کی فتح ——— ۲۳۵

مکتبہ ریاض کی طرف سے یہ پہلی کتاب شائع ہو رہی ہے، اُردو پریس جس بحرانی دور سے گذر رہا ہے، اُردو زبان کے ناشروں کو جن حوصلہ فرسا حالات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، اردو زبان کے ادیبوں اور انشا پردازوں کو جن نت نئی مشکلوں سے سابقہ پڑ رہا ہے، انھوں نے حالات کو اتنا زیادہ نامساعد اور ناسازگار بنا دیا ہے کہ نشر و اشاعت کا کام آسان نہیں رہا، دشوار سے دشوار تر ہو گیا ہے، بہت سے لوگ ہمت ہار بیٹھے، ان حالات میں ایک نئے مکتبہ کا عالم وجود میں آنا، اور ایک نئی کتاب کا شائع کرنا، جرأتِ رندانہ کا مظاہرہ ہے، اور ہم لکھنے پڑھنے والوں کے قبضہ سے اگر جرأتِ رندانہ نکل جائے تو پھر رہ کیا گیا ؟ ——— یہی تو ایک چیز ہے، جو زندگی کی آخری سانس تک ساتھ رہتی ہے !

سب سے بڑا مرحلہ کاغذ کا تھا ——— اور کاغذ کا حال بلیک مارکٹ کرنے والوں کی بدولت یہ ہو گیا تھا کہ

ہر چند کہیں کہ ہے ——— نہیں ہے !

بازار میں صد ہزار سعی و کوشش کے باوجود نایاب، اور کالے بازار میں ضرورت سے زیادہ موجود، بارہ میں جس کاغذ کا ایک ریم، دس روپے میں ملتا تھا، وہی کالے بازار میں، چالیس چالیس روپے میں ملنے لگا، اور سرمایہ داروں کا پھر بھی یہ عالم تھا کہ اس گرانی پر بھی پکار رہے تھے۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز!

خوشی کی بات ہے حکومت نے اس طرف توجہ کی، کاغذ پر کنٹرول کیا، اور ضرورت مندوں کو ضرورت کے مطابق، کنٹرول شدہ نرخ پر فراہم کرنے کا بندوبست کر دیا، اس سلسلہ میں چند دوستوں نے میری کافی مدد کی، ان میں سرفہرست چودھری محمد اقبال سلیم صاحب گاہندری مالک نفیس اکیڈیمی، کراچی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، انھوں نے میری طرف سے تمام مراحل طے کر دیئے، ورنہ دفتروں کا طواف، حکام متعلقہ سے عرض والتماس، حصولِ پرمٹ کے لئے تگ و دو، یہ سب باتیں میرے بس سے باہر تھیں:

میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟

یہ کتاب دام خیال زیادہ تر تاریخ اسلام کے مستند اور عبرت انگیز واقعات پر مشتمل ہے، تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بعد سے ملک کے پڑھے لکھے طبقہ کو، رومانی ادب سے وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے تھی، اب

تعمیری ادب کا رجحان روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، سچ پوچھئے تو بڑا اچھا شگون ہے۔

تاریخی ناول اپنی جگہ پر ایک مقام رکھتے ہیں اور کوئی شبہ نہیں اُن کی افسانہ آفرینی اور افادیت شک و شبہ سے بالا ہے، لیکن افسانوی انداز میں تاریخ کے صحیح واقعات کی جلوہ گری بھی ایک کام ہے، اور مجھے مسرت ہے کہ یہ کام کسی حد تک مجھ سے بن آیا، لیکن کس حد تک؟ ——— اس کا فیصلہ پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں، اور اُنہی کا فیصلہ آخری اور قطعی حیثیت رکھتا ہے۔

اس طرح کے تاریخی افسانوں کا ایک اور مجموعہ میرے پاس تیار ہے، اگر حکومت کی عطا کردہ سہولتوں کا سلسلہ جاری رہا تو انشاء اللہ جلد ہی اسے بھی قارئین کی خدمت میں پیش کر سکوں گا۔

رئیس احمد جعفری

کراچی۔ ۱۸ر اگست ۱۹۵۳ء

قاضی کا انصاف

کردار

عذرا ..... ایک کنیز

نصر بن حمید ..... خلیفہ حکم بن ہشام کا مصاحب خاص

سہل ..... زیاد بن میمون کا دوست

زیاد بن میمون ..... عذرا کا مالک عاشق

خلیفہ حکم بن ہشام ..... فرماں روائے قرطبہ

قاضی ابو سعید ..... قاضی شہر

(عود ہلکے اور مدھم سروں میں بج رہا ہے۔ گنگنانے کی آواز آرہی ہے عود کی آواز جاری ہے۔ یکایک مردانہ قدموں کی آہٹ اور پھر دفعتہً عود کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ دروازہ کھُلنے کی آواز۔)

عذرا: میرے آقا آپ آگئے؟

ہاں میں آگیا، عذرا۔

عذرا: تھوڑی دیر کے لئے بھی آپ باہر جاتے ہیں تو گھر کی رونق اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

نہیں عذرا یہ نہ کہو — میں اپنے ساتھ گھر کی رونق نہیں تمھاری یاد لے جاتا ہوں۔ تمھاری طرح وہ بھی میری زندگی کی ساتھی بن گئی ہے۔

عذرا: میرے آقا مجھے اپنی خوش بختی پر ناز ہے۔ مجھ جیسی کنیزیں ہر روز بازار میں بکا کرتی ہیں۔ یہ آپ کی بندہ نوازی ہے کہ آپ نے مجھے مُنہ مانگے

داموں خرید لیا۔ پھر ایسا برتاؤ کیا، ایسی آسائشیں بہم پہنچائیں کہ میں اپنا سارا غم بھول گئی۔

(ٹھنڈی سانس لے کر)

سوچتی ہوں اگر آپ کے سوا کوئی اور مجھے خرید لیتا تو کیا حشر ہوتا میرا۔

"تم ازل سے میرے مقدر میں لکھی جا چکی تھیں۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ کوئی اور تمھیں خرید لیتا"۔

"تصور کے موقلم نے میرے لئے حُسن و جمال خوبی و رعنائی عفت و عصمت عشوہ و ادا کی جو تصویر کھینچی تھی، سچ کہتا ہوں عذرا تم ہو بہو وہی ہو"۔

عذرا:۔ میرے آقا کتنے اچھے ہیں آپ!
تم مجھے آقا کیوں کہتی ہو؟

عذرا:۔ کنیز اگر اپنے مالک کو آقا نہ کہے تو کیا کہے؟

کنیز ——— عذرا میں نے فیصلہ کر لیا ہے کل صبح ہوتے ہی پہلا کام یہ کروں گا کہ تمھیں آزاد کر دوں گا۔

عذرا:۔ (گھبرا کر) نہیں، نہیں، میرے آقا یہ ظلم نہ کیجئے گا۔ میں آزاد ہونا نہیں چاہتی، میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ ساری زندگی آپ کی باندی بن کر گذار دوں گی۔ وعدہ کیجئے کہ آپ مجھے آزاد نہیں کریں گے۔

"میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔"

(سسکیوں کی آواز)

"میں تمھیں ضرور آزاد کروں گا۔"

(سسکیاں جاری تھیں)

اور آزاد کرنے کے بعد تم سے نکاح کرلوں گا۔ پھر تم مجھے آقا نہ کہہ سکوگی۔ پھر تم کنیز نہ رہوگی۔ پھر تم میری شریکِ حیات مونسِ جان اور رفیقِ زندگی بن جاؤگی۔ بولو کیا اب بھی تمھیں کچھ اعتراض ہے؟

عذرا:۔ آپ کتنے کریم، کتنے حلیم اور کتنے رحیم ہیں۔ جی چاہتا ہے آپ کا شکریہ ادا کروں، لیکن شکریہ کا بڑے سے بڑا لفظ بھی میرے جذبات کا ترجمان نہیں بن سکتا۔

"واقعی تم میرا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہو؟"

عذرا:۔ ہاں میرے آقا چاہتی ہوں آپ کا شکریہ ادا کروں، لیکن الفاظ نہیں ملتے۔

"شکریہ ادا کرنا چاہتی ہو مگر الفاظ نہیں ملتے۔ یہی بات ہے نا؟"

عذرا:۔ ہاں میرے آقا۔

"مجھے تمہاری اس بے بسی پر رحم آتا ہے۔ کیا تمھاری مدد کروں۔"

عذرا:۔ ضرور میرے آقا۔

"تو ایسا کرو۔ ابھی جب میں آیا ہوں، تم عود بجا رہی تھیں اور کچھ گنگنا

بھی رہی تھیں، بس وہی ساز اور وہی آواز مجھے سُنا دو۔ شکریہ ادا ہو جائے گا ــــ عذرا ــ میرے صبر کا زیادہ امتحان نہ لو اپنی ان نازک انگلیوں کو جنبش دو کہ ان بے جان تاروں میں زندگی کی لہر دوڑا دیں۔

تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز!

اپنے ان جاں بخش ہونٹوں کو حرکت دو کہ وہ نغموں کی بارش شروع کر دیں ــــ عذرا ــــ عذرا ــــ

عذرا:۔ میرے آقا ــــ میرے آقا ــــ

دیکھو، دیکھو۔ چاند نے اپنی گردش روک دی۔ ستارے چلتے چلتے رُک گئے۔

عذرا:۔ (گھبرا کر) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میرے آقا؟

"یہ سب تمھارا نغمہ سننے کے لئے بیتاب ہیں۔"

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

عذرا:۔ یہ کون ہے؟ دیکھئے جا کر دروازے پر۔

"مجھے نہیں معلوم، میں جاننا بھی نہیں چاہتا کون ہے؟

(کھٹ کھٹ)

عذرا:۔ کوئی ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

"کوئی بھی ہو اس وقت دروازہ نہیں کھولوں گا۔"

"دروازہ کھولو ـــــ دروازہ کھولو ـــــ"

"کون ہے ـــــ؟"

"دروازہ کھولو، ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے۔"

عذرا:۔ (گھبرا کر) یہ کون لوگ ہیں؟

"جا کے دیکھتا ہوں۔"

(دروازہ کھولنے کی آواز)

"کون ہو تم؟"

"پولیس کے سپاہی۔"

"کیا کام ہے؟"

سپاہی:۔ "ہم تلاشی لینا چاہتے ہیں اِس گھر کی۔"

"تلاشی؟ ـــــ میرے گھر کی؟ ـــــ میں لٹیرا نہیں، چور نہیں، ڈاکو نہیں، اِس طرح ناوقت آنے اور تلاشی لینے کا مطلب؟

سپاہی:۔ تم سب کچھ ہو ـــــ لٹیرے بھی۔ چور بھی۔ ڈاکو بھی ـــــ

"میں؟"

سپاہی:۔ ہاں تم، اتنی حیرت کیوں ہے؟ ہٹو راستے سے اندر جانے دو۔

"یہ میرا گھر ہے۔"

سپاہی :۔ "معلوم ہے ہمیں ۔"

دوسرا سپاہی :۔ "مگر ہم اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے ۔ اطمینان رکھو ۔"

"نہیں ۔ تم میرے گھر میں نہیں آسکتے !"

سپاہی :۔ "یہ یوں نہیں مانے گا ۔"

دوسرا سپاہی :۔ "ہٹ !!"

"نہیں ۔"

پہلا سپاہی :۔ "لے تو بھی کیا یاد کرے گا اُستاد ۔"

(مار پیٹ کی آواز ——— کوئی گرتا ہے)

"آہ !"

عذرا :۔ (چیخ کر) "یہ کیا ہوا میرے آقا ! آپ کو زخمی کر دیا ۔ ان ظالموں نے ۔"

سپاہی :۔ "تم کیوں گھبراتی ہو ۔ تمھیں کوئی زخمی نہیں کر سکتا ۔"

دوسرا سپاہی :۔ "زخمی تو تم نے کیا ہے ۔"

عذرا :۔ (گھبرا کر) غلط ، جھوٹ ، میں نے کسی کو زخمی نہیں کیا ۔"

تیسرا سپاہی :۔ "اللہ ری معصومیت !!"

پہلا سپاہی :۔ "انہی اداؤں نے تو گھائل کیا ہے ——— خلیفہ کے مصاحب خاص نصر بن حمید کو ۔"

سپاہی :۔ "ارے یار یہ تو بے ہوش ہو گیا ۔"

دوسرا سپاہی :۔ "ہو جانے دو۔ مرا تو نہیں۔ اور مر بھی جائے گا تو کیا ہو گا۔"

عذرا :۔ "نہیں نہیں ۔ یہ نہ کہو۔ وہ نہیں مریں گے۔ وہ زندہ رہیں گے۔ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ظالمو راستے سے ہٹو۔ مجھے ان کی مرہم پٹی کرنے دو۔"

(زینے پر چڑھنے کی آوازیں، جیسے کئی آدمی آ رہے ہوں)

سپاہی :۔ (آہستہ سے) "معلوم ہوتا ہے سردار نصر بن حمید آ رہے ہیں۔"

دوسرا سپاہی :۔ (سرگوشی کے لہجہ میں) "ہاں وہی معلوم ہوتے ہیں۔"

(کچھ لوگوں کے داخل ہونے کی آواز)

نصر بن حمید :۔ "کہاں ہے زیاد بن میمون جس نے اس کنیز کو خریدا تھا؟"

سپاہی :۔ "یہ پڑا ہے بے ہوش ـــــ یہ تو لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔"

نصر :۔ "بس تو اپنی سزا کو پہنچ گیا ـــ اے جاریہ تیرا کیا نام ہے؟"

عذرا :۔ (کانپتی ہوئی آواز سے) "عذرا۔"

نصر :۔ عذرا ـــــ اوہو کتنا خوبصورت، کتنا حسین و جمیل نام ہے ـــــ اتنا ہی خوبصورت جتنی تو ہے۔ اتنا ہی حسین و جمیل جتنا تیرا سراپا ہے"

عذرا :۔ "اے شخص تو کون ہے۔؟ تجھے کیا حق ہے کہ مجھے بے باک نظروں سے دیکھے۔ تجھے کس شرع و آئین نے اجازت دی ہے کہ ایک غیر عورت سے یوں ہم کلام ہو ـــــ؟ کیا تو امیر المومنین کے انصاف

سے نہیں ڈرتا ۔ ؟"

نصر :۔ (قہقہہ لگا کر) "امیر المومنین ـــــ انصاف !! زیادہ باتیں نہ کر۔ چل میرے ساتھ !"

عذرا :۔ "کہاں لے چلو گے مجھے ؟"

نصر :۔ "امیر المومنین، حکم بن ہشام فرماں روائے قرطبہ کے پاس ـــــ"

عذرا :۔ (چیخ کر) "نہیں ـــــ میں نہیں جاؤں گی ۔ میں یہیں رہوں گی ۔"

نصر :۔ "خاموش ـــــ تجھے چلنا پڑے گا ہمارے ساتھ ۔"

عذرا :۔ "میں نہیں جاؤں گی ۔"

نصر :۔ "سپاہیو ـــــ یہ اس طرح نہ مانے گی ۔ اسے جکڑ لو ۔ گرفتار کر لو ۔"

(ہاتھا پائی دھینگا مشتی کی آواز)

عذرا :۔ "یہ میرا گھر ہے میں یہیں رہوں گی ۔"

(زینے سے اترنے کی آواز)

"میں نہیں جاؤں گی ۔"

(آواز رفتہ رفتہ مدھم ہو کر دور ہوتی جاتی ہے اور فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے)

(کراہنے کی آواز)

زیاد :۔ (کمزور آواز میں) "عذرا عذرا" (پھر زور سے) "عذرا ! عذرا !!"

زیاد :۔ "یا اللہ یہ کیسا انقلاب ہوگیا ؟ عذرا کیا ہوئی ؟ یہ پولیس والے کیوں آئے تھے ؟ آہ ! کیا وہ عذرا کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ؟"

(کسی کے آنے کی آہٹ)

زیاد :۔ "کون ـــ ؟ سہل ـــ آؤ !"

سہل :۔ "زیاد تم بہت کمزور ہو لیٹے رہو۔"

زیاد :۔ "ہاں لیٹوں گا ـــ لیکن بستر پر نہیں قبر میں ـــ یہ ظلم و ستم کا پہاڑ یک بیک مجھ پر ٹوٹ پڑا سہل۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا ؟ سمجھ میں نہیں آتا ؟ پولیس والے یہاں کیوں آئے اور آئے تھے تو مجھے مار ڈالتے۔ لیکن عذرا کو کیوں لے گئے ؟"

سہل :۔ "پولیس والوں نے جو کچھ کیا نصر بن حمید کے حکم سے کیا۔"

زیاد :۔ "نصر بن حمید خلیفہ کا منہ چڑھا مصاحب ؟"

سہل :۔ "ہاں وہی !!"

زیاد :۔ "نہیں نہیں۔ تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہاں صرف پولیس والے آئے تھے۔ نصر نہیں آیا۔"

سہل :۔ "آیا تھا۔ میں نے خود دیکھا۔ میں جھروکے سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ سُن رہا تھا، وہی عذرا کو زبردستی لے گیا۔ کیسا کیسا چیخی پیٹی ہے بے چاری، مگر ظالم نے ایک نہ سُنی۔"

زیاد :۔ "آہ ــــ عذرا! اب میں کیا کروں گا۔ میری زندگی ویران ہوگئی۔ میں برباد ہوگیا۔ زندگی میرے لئے زہر بن گئی۔ موت ــ تو کہاں ہے"

سہل :۔ "ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہو زیاد!"

زیاد :۔ "تو کیا تمھاری رائے ہے صبر کروں۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ، کیا اتنے بڑے حادثہ پر صبر کیا جا سکتا ہے؟"

سہل :۔ "صبر کے ساتھ جد وجہد کی جا سکتی ہے۔"

زیاد :۔ "نہیں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ نصر کے مقابلہ میں انصاف نہیں مل سکتا۔ ٹھوکریں مل سکتی ہیں۔"

سہل :۔ "جب تک قاضی ابو سعید مسند قضا پر متمکن ہیں۔ انصاف کا ہاتھ خلیفہ بھی نہیں پکڑ سکتا۔"

زیاد :۔ "قاضی ابو سعید ہاں تم ٹھیک کہتے ہو سہل۔ میں قاضی ابو سعید کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ یا تو وہاں سے اپنی عذرا کو لے کر آؤں گا ورنہ وہ سنگِ آستاں ہوگا اور میرا لہو لہان سر۔"

عذرا :۔ "میں آپ کو، آپ کی دولت کو، آپ کی دی ہوئی ہر نعمت کو حقارت کے ساتھ ٹھکراتی ہوں۔ میں ایک دفعہ خریدی گئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بک گئی۔ اب ہفت اقلیم کی دولت بھی مجھے نہیں خرید سکتی زندگی کی آخری سانس تک میں زیاد اور صرف زیاد کا دم بھرتی رہوں گی۔"

نصر :۔ (قہقہہ لگا کر) "تیرے غصّہ میں بھی بانکپن ہے۔ تیرا جلال بھی تیرے جمال سے کم دلکش نہیں ـــــ تو چپ کیوں ہوگئی۔ اپنے تیز و تند تلخ اور ترش الفاظ کا سارا ذخیرہ استعمال کر ڈال، تیرے الفاظ کی تندی اور تیزی میں وہی لطف آتا ہے جو مئے ارغوانی کے چھلکتے ہوئے جام میں ـــــ میں نے ذرا بھی بُرا نہیں مانا۔"

عذرا :۔ "یہ لگاوٹ کی باتیں مجھ پر اثر نہیں کر سکتیں۔"

نصر :۔ "آخر تو چاہتی کیا ہے؟"

عذرا :۔ "آپ کے پنجۂ ہوس سے رہائی۔"

نصر :۔ (قہقہہ لگا کر) "رہائی ـــ اگر میں تجھے رہا کر دوں تو بھی تو زیاد کے پاس نہیں جا سکتی۔"

عذرا :۔ (سہم کر) "کیوں ـــ؟"

نصر :۔ "یہ میرا فیصلہ ہے۔"

عذرا:۔ (جوش سے) "ہاں یہ تیرا فیصلہ ہے۔ اور مجھے بتایا گیا ہے کہ تو اپنا فیصلہ نہیں بدلا کرتا۔"

نصر:۔ "بالکل سچی بات ہے۔ میرا فیصلہ ہمیشہ اٹل ہوتا ہے۔"

عذرا:۔ "اگر تو خدا ہے تو بے شک تیرا فیصلہ قطعی اور آخری ہے۔ لیکن اگر تو بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک حقیر بندہ ہے تو کان کھول کر سن لے تیرے فیصلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہتکڑی کا جالا ہے۔"

نصر:۔ "خاموش بے ادب چھوکری! تو حد سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کوئی ہے۔"

آواز:۔ "حاضر ——"

نصر:۔ "اسے لے جاؤ —— یہ گستاخ لونڈی ابھی تربیت کی محتاج ہے۔"

(قصرِ خلافت۔ خلیفہ ہشام سے نصر مخاطب ہے)

نصر:۔ "امیرالمومنین! غلام تخلیہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔"

خلیفہ ہشام:۔ "جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو یہاں کوئی نہیں ہے۔ اور ہمارے اذن کے بغیر کسی میں جرأت نہیں کہ قدم رکھ سکے۔"

نصر:۔ "دیوار ہم گوش دارد۔"

خلیفہ:۔ "یہاں کی دیواریں بھی اسی طرح بہری اور گونگی ہیں جس طرح اس خلوت گاہ خاص کے خدام۔ پہلے یہ تو بتاؤ تم اتنے دن کہاں غائب رہے؟"

نصر :۔ "غلام مصر گیا تھا، امیر المومنین !"

خلیفہ :۔ "ہم نے سُنا ہے کہ مصر کے بازار میں دُنیا جہان کی خوب صورت اور پری جمال کنیزیں بکتی ہیں ۔ کیا یہ سچ ہے ؟"

نصر :۔ "بالکل سچ ۔ وہاں حُسن کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں کہ کوہ قاف کی پریاں بھی اُن کے آگے پانی بھرتی ہیں ۔"

خلیفہ :۔ "پھر تم نے کچھ خریداری کی ؟"

نصر :۔ "نقد جان دے کر ایک نایاب تحفہ امیر المومنین کے لئے لایا ہوں۔"

خلیفہ :۔ "کیا چیز ہے وہ ؟"

نصر :۔ "وہ ایک کنیز ہے ۔ اُس کا گانا سُن کر ناہید فلک کو پسینہ آجاتا ہے اس کا رقص بے محابہ دیکھ کر طاؤس اپنا ناچ بھول جاتا ہے ۔ اس کے دانت ایسے ہیں جیسے دُرِ عدن ۔ اُس کے ہونٹ سیب کی قاش ۔ اُس کی آنکھیں بادام کی طرح ——————"

خلیفہ :۔ "کہاں ہے وہ ؟"

نصر :۔ "اب تک وہ میرے سیہ خانے کی روشنی تھی ۔ آج سے قصرِ سُلطانی کے بام و در اس کی ضیاء سے جگمگائیں گے ۔"

خلیفہ :۔ "ہم اُسے دیکھنا چاہتے ہیں ۔"

نصر :۔ وہ صرف اسی لئے ہے کہ حرمِ سُلطانی میں داخل ہو کر ظلِ الٰہی کی

دل بستگی کا سبب بنے۔ لیکن ——"

خلیفہ:۔ "لیکن کیا؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

نصر:۔ "وہ آہوئے وحشی ہے۔ ابھی تادیب و تربیت کی ضرورت ہے۔"

خلیفہ:۔ یہ ہونا رہے گا۔ کنیزانِ حرم راہ پر لے آئیں گی اُسے۔ ہماری خدمت میں پیش کرو۔"

نصر:۔ "بہت خوب ظلِ الٰہی۔ ابھی تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔"

خلیفہ:۔ "ہم منتظر ہیں۔"

نصر:۔ "ظلِ اللہ! یہ ہے وہ دُرِ بے بہا، جسے غلام اپنی جان خطرے میں ڈال کر لایا ہے۔"

خلیفہ:۔ "ہوں —" (سسکیوں کی آواز) "لیکن یہ اتنی دلگیر اور سوگوار کیوں نظر آرہی ہے؟" (سسکیاں) "اے جاریہ تیرا کیا نام ہے؟ (سسکیاں)

نصر:۔ "ظلِ اللہ اس کنیز کا نام عذرا ہے۔ اسے دیکھ کر قبیلہ عذرا کی وہ نازنینیں یاد آجاتی ہیں۔ جن کے حُسن دلاویز اور چشم سحر خیز نے نوجوانان عرب کا قرار چھین لیا تھا۔ جن کے سامنے شہسوار اور تیغ زن سر جھکاتے تھے۔ جن کے حاصل کرنے کے لئے میان سے تلواریں نکلی تھیں۔ فضا

ہیں نیزے چمکتے تھے۔ ریت کے سمندر میں خون کے دریا بہتے تھے۔
قتل و غارت اور کشت و خون کا بازار گرم ہو جاتا تھا۔"

خلیفہ :۔ "یہ بھی تو کہو۔ شاعر شعر کہتے تھے۔ تشبیب سے کام لیتے تھے اور اُن کے شعر زبانِ عوام پر جا کر ترانے بن جاتے تھے۔"

نصر :۔ "ظل اللہ !"

خلیفہ :۔ "اِس کنیز کو حرمِ شاہی میں پہنچا دیا جائے۔ نصر یہ کنیز تم نے کتنے میں خریدی تھی ـــــ ؟"

نصر :۔ "غلام کی طرف سے آقا کی خدمت میں یہ ایک حقیر تحفہ ہے۔"

خلیفہ :۔ "ہم نے اس تحفے کو قبول کر لیا۔ اس خیر خواہی پر تم انعام کے سزاوار ہو۔ جاؤ ہم نے حکم دیدیا ہے۔ خزانۂ سلطانی سے ایک لاکھ اشرفیوں کے توڑے لے لو۔"

نصر :۔ تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(قاضی ابو سعید کا ایوان عدالت)

زیاد :۔ (بلند آواز سے) "انصاف ! انصاف !!"

قاضی ابو سعید :۔ "تم کون ہو ؟ تمھیں کیا شکایت ہے ؟"

زیاد :۔ "قاضی صاحب، میں لُٹ گیا، برباد ہوگیا، میری زندگی غارت کردی گئی۔ میری زندگی کا سکھ چھین لیا گیا۔"

قاضی :۔ "خدا کے بندے اتنے پریشان کیوں ہوتے ہو؟"

زیاد :۔ "آہ! میرا قرار چھین لیا گیا۔ میرا سکون لوٹ لیا گیا۔ میں کہیں کا نہ رہا۔"

قاضی :۔ "اطمینان رکھو۔ تمہارے ساتھ پورا انصاف ہوگا۔"

زیاد :۔ "انصاف ہوگا؟ میرے ساتھ انصاف ہوگا۔" (ٹھنڈی سانس بھرکر) یہ طفل تسلی ہے قاضی صاحب۔ میرے ساتھ انصاف نہیں ہوسکتا۔"

قاضی :۔ "بہت سہمے ہوئے ہو۔ شاید تم پر کوئی بڑا ظلم ہوا ہے۔ استغاثہ پیش کرو۔"

زیاد :۔ "کس کے خلاف؟"

قاضی :۔ "ملزم کے خلاف۔"

زیاد :۔ "آہ ــــ! یہی تو نہیں کرسکتا۔"

قاضی :۔ "کیا نہیں کرسکتے؟ جھجکتے کیوں ہو؟ ڈرتے کس سے ہو؟ ملزم کا نام کیوں نہیں لیتے۔ کیا یہ سمجھتے ہو ہمارا دست انصاف ملزم تک نہیں پہنچ سکتا؟"

زیاد :۔ یہی بات ہے قاضی صاحب۔ ملزم کی شخصیت اتنی بڑی ہے کہ

وہاں آپ کے عدل و انصاف کے پاؤں کانپیں گے۔"

قاضی:۔ (جوش سے) "ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ عدالت اسلامی کا اقتدار بڑی سے بڑی شخصیت کو اس کٹہرے میں لاکر کھڑا کرسکتا ہے۔ تم استغاثہ پیش کرو۔ ملزم کا نام بتاؤ۔"

زیاد:۔ قاضی صاحب ایسا نہ ہو میرے ساتھ آپ کا انصاف بھی رسوا ہو۔"

قاضی:۔ "نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔"

زیاد:۔ "تو میں عرض کرتا ہوں۔ پہلا ملزم نصر بن حمید ہے۔ خلیفہ کا معتمد خاص۔ جس نے گھر میں گھس کر میری کنیز عذرا کو جبراً چھینا۔ مجھے زدوکوب کیا۔"

قاضی:۔ "ہوں — اور دوسرا ملزم —؟"

زیاد:۔ "اور دوسرا ملزم خود خلیفہ ہے۔ جس نے عذرا کو خریدا اور مجھے زندگی سے محروم کردیا۔ (بیتابی کے ساتھ) قاضی صاحب میں عذرا سے محبت کرتا ہوں۔ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ بھی مجھے چاہتی ہے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے آزاد کرکے نکاح کرلوں گا۔ لیکن آہ — (رونے لگتا ہے)

قاضی:۔ (بلند آواز سے) "عذرا تمھیں ملے گی (اور بلند آواز سے) نصر بن حمید کو حاضر کیا جائے۔"

قاضی :۔ "نصر تم کیا کہتے ہو؟ گواہ گذر چکے ہیں۔ تمہارا جرم ثابت ہو چکا۔"

نصر :۔ "میں کنیزیں خرید رہا تھا۔ زیاد نے بیچ میں ٹانگ اڑا دی۔ میں نے دس ہزار درہم کہے۔ اُس نے بیس ہزار میں سودا کر لیا۔ یہ گستاخی میری غیرت کے لئے تازیانہ ثابت ہوئی اور ——— "

قاضی :۔ "اور عذرا کو تم نے چھین لیا ——— کیوں؟"

نصر :۔ "جی ہاں۔ میں نے اپنے لئے نہیں ظل اللہ کے لئے۔"

قاضی :۔ "اور ظل اللہ نے (کڑک کر) اس سودے کو منظور کر لیا؟"

نصر :۔ "ظل اللہ کی شخصیت ہر اعتراض اور ہر احتساب سے ماورا ہے وہ خلیفتہ اللہ ہیں۔ ظل اللہ ہیں۔ امیر المومنین ہیں۔"

قاضی :۔ (بلند آواز سے) "خاموش!!"

نصر :۔ (گھبرا کر) "میں امیر المومنین کا ——— "

قاضی :۔ "خاموش۔ یہ ایوان عدالت ہے۔ یہ وہ مسند قضا ہے جس پر رسول کریم اور خلفائے راشدین بیٹھ چکے ہیں۔ اس مسند پر خدا کے سوا کسی کی بالادستی قائم نہیں ہو سکتی۔ حکم امیر المومنین کو بھی اسی طرح حاضر ہونا پڑے گا۔ جس طرح زیاد آیا ہے۔ جس طرح نصر طلب کیا گیا ہے۔ اور اگر وہ مجرم ثابت ہو گیا تو امیر المومنین ہونے کے باوجود اُسے بھی سزا ملے گی۔ اسلام کا انصاف سُلطان وزیر

اور گدائے بے نوا سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے۔ نہ وہ کسی سے مرعوب ہوتا ہے نہ کسی کی رعایت کرتا ہے۔ حکم خلیفۃ المسلمین کے نام فرمان حاضری صادر کیا جائے۔"

قاضی :۔" حکم! تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو؟"

خلیفہ حکم :۔" مجھے نصر نے دھوکا دیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مصر سے میرے لئے کنیز لایا ہے۔ میں نے اسے قبول کیا۔ مجھے قطعاً معلوم نہ تھا کہ وہ زیاد کی ہے۔ اپنی غلط فہمی پر مجھے ندامت ہے۔ میں کنیز زیاد کو واپس کرتا ہوں۔ زیاد آج سے میرا دوست ہے اور عذرا بہن ہے ان دونوں کی دھوم دھام سے شادی میں اپنی طرف سے کرونگا۔ جاگیر بخشوں گا، انعام دوں گا، زندگی بھر یہ دونوں میرے لطف وکرم کے سایئے میں رہیں گے ـــــ اور نصر کے لئے ـــــ؟"

قاضی :۔" اس کے لئے ہم پچاس دُرّوں کی سزا تجویز کرتے ہیں۔"

حکم :۔" بسر وچشم۔"

قاضی :۔" زیاد بتاؤ تم مطمئن ہوگئے؟ انصاف تمھیں ملا؟"

زیاد :۔ مل گیا۔ میں نے سب کچھ پالیا۔ آپ نے انصاف کی لاج رکھ لی

آپ نے بتادیا کہ اسلام اب بھی زندہ ہے۔ ایک معمولی اِنسان کا استغاثہ خلیفہ کے خلاف سُنا جاسکتا ہے۔ ایک معمولی شخص کی طرح ملزم کے کٹہرے میں خلیفہ تک کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ اس سے باز پُرس ہوسکتی ہے، اس کا احتساب کیا جاسکتا ہے۔ اُسے سزا دی جاسکتی ہے۔ اِسلام زندہ باد!"

مہاجر

کردار

میر صاحب	ایک مہاجر
رابعہ	اُن کی بیوی
زینت	لڑکی
محمود	لڑکا
اختر	ایک یتیم لڑکا
خاں صاحب	میر صاحب کے بچپن کے دوست

حکیم، ڈاکٹر وغیرہ

(ایک خس پوش جھونپڑی)

ماں :۔ زینت ! ارے بیٹی زینت !!

زینت :۔ جی اماں آئی ۔

(قدموں کی آہٹ)

ماں :۔ کیا کر رہی تھیں بیٹی ؟

زینت :۔ آٹا گوندھ رہی تھی ۔

ماں :۔ خالی آٹا گوندھ کر کیا کروگی بیٹی ۔ دال ترکاری تو کچھ ہے نہیں۔

زینت :۔ شاید ابّا اپنے ساتھ لے آئیں ۔ آج بڑی دیر ہوگئی ۔ اب تک نہیں آئے ۔

ماں :۔ ہاں شام ہوگئی ۔ نہ جانے کیوں دیر ہوگئی آج اُنھیں ۔ اندھیرے میں دم گھُٹ رہا ہے ۔ ذرا چراغ تو جلالے بچّی ۔

زینت :۔ چراغ کہاں سے جلاؤں ؟ تیل کی تو ایک بوند بھی نہیں ۔

ماں :۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) شکر ہے خدا کا ـــــ بڑی دیر سے میں نے محمود کو نہیں دیکھا۔ کہاں نکل گیا ؟

زینت :۔ گیا کہاں ـــــ ؟ اسکول سے آتے ہی چلا گیا وہاں میچ ہیں۔ کہہ رہا تھا آج اس کی ٹیم بھی کھیلے گی ۔

ماں :۔ اے تو کیا رات کو میچ کھیلا جائے گا ؟

زینت :۔ لیجئے وہ آ گیا ۔ دیکھئے پسینہ پسینہ ہو رہا ہے بے چارہ

(محمود سامنے آتا ہے اور گنگنا رہا ہے)

محمود :۔ ہم کون تھے ہم کیا ہیں دُنیا کو بتا دیں گے
مشرق کا سرا لے کر مغرب سے مِلا دیں گے

ماں :۔ اے کچھ دیوانہ ہو گیا ہے لڑکے ؟

محمود :۔ اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اُتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

زینت :۔ اوئی کان کے پردے پھاڑ دیئے محمود تم نے تو اچھا چونچلا ہے یہ بھی ۔ ہٹو بھئی واہ !

محمود :۔ آپا ہماری ٹیم جیت گئی ۔

ماں :۔ بھاڑ میں جائے تیری ٹیم ۔ خبردار جواب کبھی شام کو گھر سے باہر

محمود :۔ اچھا اماں اب نہیں جاؤں گا۔

(پھر شاعری شروع کر دیتا ہے)

کبھی اے نوجواں مسلم، تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

زینت :۔ محمود میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اتنے زور سے تو نہ چیخ۔

محمود :۔ (بلند آواز سے) ؎

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہانگیر و جہاں بان و جہاں دار و جہاں آرا

زینت :۔ اماں دیکھ لیجئے۔ نہیں مانتا یہ محمود۔ میرا سر کھائے جا رہا ہے۔

محمود :۔ دیکھ لیجئے اماں۔ یہ زینت آپا تو خواہ مخواہ جلا کرتی ہیں مجھ سے اب شعر پڑھنا بھی گناہ ہو گیا۔

ماں :۔ اچھا بس ہو چکی شعر خوانی۔ کتاب اٹھا سبق یاد کر۔

زینت :۔ تیل تو ہے نہیں، کیا اندھیرے میں سبق یاد کرے گا۔ مجھے بھی اپنی کتاب پڑھنی تھی۔

محمود :۔ تیل نہیں ہے تو کیا ہوا۔ میرے پاس علاء الدین کا چراغ جو ہے۔ دیکھو ابھی روشنی ہوتی ہے۔ ذرا ماچس تو دینا۔

زینت :۔ وہاں چولھے کے پاس رکھی ہے، خود اُٹھالو جاکر۔

محمود :۔ مجھ سے اندھیرے میں کوئی چیز گر پڑے گی خواہ مخواہ۔

زینت :۔ بڑی چیزیں رکھی ہیں جو گر پڑیں گی۔ کہیں خود نہ گر پڑنا۔

(محمود ہنستا ہے۔ جانے کی آواز)

محمود :۔ زینت آپا آنکھیں بند کرلو۔ علاءالدین کا چراغ جلاتا ہوں۔

زینت :۔ بند کرلیں ۔ جلاؤ۔

(ماچس رگڑنے کی آواز)

محمود :۔ یہ دیکھو جل گیا۔ آنکھیں چکاچوند ہوئیں یا نہیں ؟

زینت :۔ (ہنس کر) یہ ذرا سی موم بتّی کتنی دیر چلے گی تمہاری ؟

محمود :۔ اتنی دیر تو چل ہی جائے گی کہ تمہیں سنانے کو دو چار شعر یاد کرلوں۔

ماں :۔ (ہنس کر) تو بھی بڑا شریر ہے۔ ہر وقت چھیڑا کرتا ہے بہن کو۔

(قدموں کی آہٹ)

زینت :۔ (سرگوشی کے لہجہ میں) ابّا آگئے !

ماں :۔ بڑی دیر لگادی تم نے ـــــ اے یہ تمہارے ساتھ چھوکرا کون ہے ؟

باپ :۔ میرا بیٹا۔ یہ آج سے محمود اور زینت کا بھائی ہے۔ بیٹی زینت!

زینت :۔ جی ابّا جی۔

باپ :۔ جاؤ اسے لے جاکر ہاتھ منہ دُھلاؤ۔ پھر محمود کے کپڑوں میں سے ایک

جوڑا نکال کر پہنادو۔

زینت :۔ بہت اچھا۔

(جاتی ہے)

ماں :۔ میں کہتی ہوں آخر یہ چھوکرا کون ہے؟

باپ :۔ کہہ تو رہا ہوں میرا لڑکا ہے اور کون ہے۔

ماں :۔ پھر وہی لگے پہیلیاں بجھانے۔ یہی تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔

باپ :۔ اچھا بھئی، کیوں خفا ہوتی ہو۔ بتائے دیتا ہوں۔ کہتا ہے آگرہ کا رہنے والا ہے۔ باپ یہاں آتے ہی مرگیا۔ ماں چند دن ہوئے موٹر سے کچل کر مرگئی۔ اب نہ کہیں ٹھکانہ ہے، نہ آسرا۔ نوکری ڈھونڈنے نکلا تھا بے چارہ۔ ذرا دیکھو تو یہ عمر اور نوکری، میرا تو دل ہل گیا۔ خدا یہ وقت کسی پر نہ ڈالے۔ بھئی مجھ سے تو ضبط نہ ہو سکا۔ اپنے ساتھ لے آیا۔ ہرچہ بادا باد۔

ماں :۔ لیکن ——

باپ :۔ نہیں بھئی۔ لیکن ویکن کی سند نہیں، چہرہ دیکھ لو۔ کتنی معصومیت برستی ہے غریب پر —— یہ اس گھر میں رہے گا اور اس کے ساتھ وہی برتاؤ ہوگا جو محمود اور زینت کے ساتھ ہوتا ہے۔

ماں :۔ وہ تو میں نے مانا۔ میں نے تو جب سے اسے دیکھا ہے۔ دل

گڑھ رہا ہے (ٹھنڈی سانس لیکر) ماں باپ بھی کم عمر اولاد کے لئے بڑی نعمت ہیں۔

باپ:۔ سچ کہتی ہو۔ اور اگر سچے دل سے کہتی ہو تو یہ بچہ کبھی بھی یہ محسوس نہ کرنے پائے کہ یہ نعمت اس سے چھن چکی ہے۔

ماں:۔ یہی کوشش کرونگی۔ لیکن اس گھر میں کیا سکھ ملے گا بے چارے کو حالت تو یہ ہے کہ آٹا گندھا رکھا ہے۔ نہ دال ہے نہ ترکاری۔ ہم لوگ تو نمک مرچ سے بھی روٹی کھالیں گے مگر یہ مہمان؟ اسے روکھی روٹی کھلاتے شرم نہیں آئے گی؟

باپ:۔ ضرور آئے گی۔ کم سے کم آج ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ پھر دو چار روز میں جب وہ مانوس ہو جائے گا پھر کوئی بات نہیں۔

ماں:۔ یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔

باپ:۔ کچھ بھی نہیں ہے گھر میں؟

ماں:۔ یہ لو، کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ بے چاری زینت آس لگائے بیٹھی تھی، تم آؤ گے تو دال ترکاری اپنے ساتھ لیتے آؤ گے۔

باپ۔ ہاں۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ جن سیٹھ صاحب کے ہاں پندرہ دن کام کرنے کے بعد جواب مل گیا تھا، اب تک اُن کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ مگر وہ آج دفتر ہی نہیں آئے۔ اُنہیں کیا معلوم ہم پر کیا

گذری ہے۔

ماں :۔ میں کہتی ہوں آخر اس لڑکے کا کیا ہوگا ؟ آج یہ ایک نئی مصیبت مول لے آئے تم !

باپ :۔ نئی مصیبت ؟

ماں :۔ ہاں اور کیا ؟ سوچو تو سہی۔ آدمی کو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیئے جب ہم خود نہیں کھا سکتے، کسی دوسرے کو کہاں سے کھلائیں گے۔

باپ :۔ رابعہ بیگم، یہ آج تمہیں کیا ہوگیا ہے ؟ کیسی باتیں کر رہی ہو تم ؟ ہمیں تمہیں ایک دوسرے کا رفیق زندگی بنے تیس برس ہوگئے۔ اس طویل مدّت میں آج پہلی بار تم میری نظر میں سُبک ہوئی ہو۔ تم خوش حالی میں جتنی فراخ دل تھیں غربت نے اتنا ہی تمہیں تنگ دل بنا دیا۔ اپنا دیس، اپنا گھر، اپنی جائداد، اپنا مال بیچ کر میں یہاں آیا یہاں آنے کے بعد جیسی تنگی ترشی سے بسر ہو رہی ہے، جن مصیبتوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ جو دشواریاں آڑے آرہی ہیں اُن سب کا میں نے خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ کبھی ہراساں نہیں ہوا۔ کبھی بددل نہیں ہوا۔ کبھی مایوس نہیں ہوا، کبھی مغموم نہیں ہوا، لیکن آج کسر نکل گئی۔ آج مجھے وہ صدمہ پہنچا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔

(ٹھنڈی سانس)

ماں :۔ آخر کیا ہوا ؟ کیا کیا میں نے ؟

باپ :۔ اور اس سے زیادہ کیا کہو گی ۔ یہ بیچارہ اختر، جس کا باپ مر چکا، ماں گذر گئی ۔ اس وسیع دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں یہ سر چھپا سکے ۔ کوئی ایسا نہیں جسے یہ اپنا کہہ سکے ۔ اسے میں پناہ دیتا ہوں، تو تم بُرا مانتی ہو ۔۔۔ ذرا سوچو تم بھی ہمیشہ نہیں جیو گی، میں بھی آج مرا کل دوسرا دن ، اگر یہی دن زینت اور محمود کو دیکھنا پڑے تو؟

ماں :۔ اے خدا نہ کرے ۔ دشمنوں کے مُنہ میں خاک ۔

باپ :۔ ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا ، وہی ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے یہ دنیا کسی کا ساتھ نہیں دیتی ، یہاں ہر روز انقلابات آتے رہتے ہیں کل تک ہمارے پاس کیا نہ تھا ؟ کس چیز کی کمی تھی ہمیں ؟ مگر آج ؟ ذرا سوچو دیکھتے دیکھتے کیا ہو گیا ۔ شاندار حویلی کی بجائے یہ معمولی سی جھونپڑی ہمارا مسکن ہے ۔ روپیہ کی ریل پیل ختم ہوئی ۔ اب ایک پیسہ کو ہم ترستے ہیں ۔ پہلے ہمارے دسترخوان پر کئی قسم کے کھانے ہوتے تھے ، اب روکھی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے ۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ نوکروں کا ہجوم لگا رہتا تھا ۔ آج میں خود اپنے ایک ایک در پر نوکری کی بھیک مانگنے جاتا ہوں ۔ کہیں سے دھتکار دیا جاتا ہوں ۔ کہیں کوئی عارضی سا کام مل جاتی ہے سو پچاس کی ، کیا ان سارے انقلابات سے تم نے یہی سبق

لیا ہے کہ اپنے دل کو اور زنگ آلود کر لو۔ آدمی کی آدمیت مصیبت کے وقت پہچانی جاتی ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ تم پہلے ہی امتحان میں بُری طرح فیل ہو گئیں۔

ماں :۔ تم تو پاس ہو گئے بڑے اچھے نمبروں سے۔ اب دیکھو نگی کیا کھلاؤ گے اسے ؟

باپ :۔ میری جیب میں چار آنے ہیں۔ چار آنے کا سالن کافی ہو گا۔

ماں :۔ اللہ رکھے پانچ آدمی چار آنے کے سالن میں کھا لیں گے ؟

باپ :۔ نہیں۔ صرف اختر کھائے گا۔ اور جب وہ کھا پی کر سو جائے گا، ہم حسب معمول روکھی روٹی کھائیں گے۔ خدا کا شکر ادا کریں گے اور سو جائیں گے۔

رابعہ بیگم :۔ کہو آج بھی سیٹھ سے ملاقات ہوئی کہ نہیں ؟

میر صاحب :۔ حساب بے باق کر دیا سیٹھ نے۔

رابعہ بیگم :۔ شکر ہے۔ کیا لائے ؟

میر صاحب :۔ کل ۳۵ روپے ملے تھے۔ ۲۵ تو قرضداروں کو دیدیئے۔ دس بچ رہے ہیں وہ جیب میں ہیں۔

رابعہ بیگم :۔ وہ بھی کسی کو دے کر سوارت کر آتے۔

آواز :۔ ارے بھئی میر صاحب ہیں ؟

میر صاحب :۔ ذرا تم اِدھر آڑ میں ہو جاؤ ۔ خاں صاحب آئے ہیں (بلند آواز سے) آیئے خاں صاحب تشریف لائیے ۔

خاں صاحب :۔ کہیئے مزاج کیسا ہے ؟

میر صاحب :۔ دُعا ہے آپ کی ـــ سُنائیے کوئی نئی خبر ۔

خاں صاحب :۔ ہاں ایک بڑے کام کی خبر لایا ہوں ۔

میر صاحب :۔ وہ کیا ؟

خاں صاحب :۔ شہر کی جن دُکانوں پر سیل لگی تھی وہ الاٹ ہونے والی ہیں لوگوں کو ۔

میر صاحب :۔ بڑی اچھّی خبر ہے ۔ آپ بھی دے رہے ہیں درخواست

خاں صاحب :۔ اجی میں نے تو اپنی درخواست بھیج بھی دی ۔ آپ سے کہنے آیا ہوں ۔ ایسا موقع مشکل سے ملے گا ۔ دیر نہ کیجئے ۔

میر صاحب :۔ آپ کا مقصد یہ ہے کہ میں بھی درخواست گذار دوں کہ

لئے ہوئے یہ دِل بیقرار ہم بھی ہیں

خاں صاحب :۔ اور کیا ؟

میر صاحب :۔ نہیں خاں صاحب مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا ۔

خاں صاحب :۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ کیوں آخر ؟

میر صاحب :۔ اپنا اپنا اصول اور مذاقِ طبیعت ہے۔ میں اپنی مہاجرت کا معاوضہ لینا پسند نہیں کرتا۔

خاں صاحب :۔ یہ بھی خوب فرمایا آپ نے۔ ارے بھئی اپنا خیال نہیں کرتے تو اپنے بچّوں کا تو خیال کرو۔

میر صاحب :۔ انہی کا خیال مجھے اس قسم کے کام کرنے سے روکتا ہے میں چاہتا ہوں وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھیں۔ اگر اُن کے باپ میں ہمّت ہے کہ وہ اپنا بھرا پُرا گھر چھوڑ دے تو ان میں یہ حوصلہ ہونا ہونا چاہیئے کہ اپنا نیا گھر خود اپنے ہاتھ پاؤں کی قوّت سے تعمیر کر سکیں۔ ایک طرف ایثار اور دوسری طرف حسنِ طلب میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔

خاں صاحب :۔ اِس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم مہاجرین کو اسی پریشانی اور بے روزگاری کے عالم میں زندگی گذارنی چاہیئے۔

میر صاحب :۔ میں تو صرف اپنے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ دوسروں کے بارے میں تو نہیں کہتا۔ میں اپنے فعل کا مختار ہوں۔ دوسرے اپنے فعل کے۔ میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا کہ اپنا اپنا اصول ہے۔ میں یہ اصول قائم کر چکا ہوں کہ مکان، دُکان، کھیت کسی چیز کی طرف دست طلب نہیں بڑھاؤں گا۔ زندگی میں بہت عیش کر چکا

اب ذرا غربت اور فاقہ کشی کا مزہ بھی چکھوں۔

خاں صاحب :۔ ہاں بھئی۔ لیکن یہ تو ہمارا حق ہے۔ اپنے حق سے کیوں دست بردار ہوں۔

میر صاحب :۔ خاں صاحب یہیں سے میرے اور آپ کے نقطۂ نظر میں اختلاف پیدا ہے۔ آپ حق پر زور دیتے ہیں۔ اور میں فرض کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔

خاں صاحب :۔ معاف کیجئے گا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میں بالکل نہیں سمجھا۔

میر صاحب :۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں حق مانگنے سے نہیں ملتا۔ فرض ادا کرنے سے ادا ہو جاتا ہے۔ حق مانگنے میں، پانے میں، لینے میں دشواریاں ہیں، مخالفتیں ہیں۔ نہ جانے کیا کیا ہے۔ فرض کے ادا کرنے میں نہ کوئی دشواری ہے، نہ مخالفت کا اندیشہ۔

خاں صاحب :۔ ذرا اور وضاحت کیجئے۔

میر صاحب :۔ میرا حق ہے کہ مجھے مکان ملے، میرے نام دکان الاٹ ہو مجھے کھیت دیا جائے۔ کسی کارخانے یا فیکٹری پر مجھے قبضہ دیا جائے کسی مشین یا انجن کا قبالہ مجھے لکھ دیا جائے۔ لیکن جب میں یہ حق مانگنے نکلوں گا تو کسی سے میرا مقابلہ ہوگا۔ کوئی سفارشیں لائے گا۔ کوئی مخالفت کرے گا۔ کسی سے دشمنی مول لونگا۔ بہت سے جھگڑے

ہیں جن سے نپٹنا پڑے گا۔ کہیئے ہاں۔

خاں صاحب:۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔

میر صاحب:۔ اور میرا فرض یہ ہے کہ اپنی روزی محنت سے کماؤں۔ میں مزدوری کر سکتا ہوں۔ قلی بن سکتا ہوں۔ ڈلیا ڈھو سکتا ہوں۔ ملازمت کر سکتا ہوں۔ ٹھیلہ چلا سکتا ہوں پھر کیوں نہ ہر آرزو اور تمنّا کو دل سے نکال کر محنت کروں اور روٹی کھاؤں۔

خان صاحب:۔ ارے میاں خوب باتیں بنالو۔ ہم نے بھی خوب تماشے دیکھے ہیں۔ تم بھی جی بھر کے دیکھ لو۔ تباہی کا تماشہ دیکھنے والے بہت ہیں ہمدردی کرنے والا کوئی نہیں۔ مذاق اُڑانے والوں کی کمی نہیں۔ ساتھ دینے والا کہیں نظر نہیں آتا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ ہمارا اگر کچھ فرض ہے تو دوسروں پر بھی کچھ فرض عائد ہوتا ہے۔

میر صاحب:۔ ضرور عائد ہوتا ہے۔

خاں صاحب:۔ مگر

میر صاحب:۔ اگر مگر سے کام نہیں چلے گا خاں صاحب۔ حق مانگنے اور فرض ادا کرنے میں بھی تو فرق ہے۔ ہم جب حق مانگتے ہیں تو مجبور ہیں کہ دیکھیں اور محسوس کریں کہ فلاں کو حق نہیں ملا۔ فلاں کو ضرورت سے زیادہ مل گیا۔ فلاں کو ضرورت سے کم ملا۔

خاں صاحب :۔ بالکل ٹھیک ۔ یہ ہونا ہی چاہیئے ۔

میر صاحب :۔ جی ہاں ضرور ہونا چاہیئے ۔ لیکن جب ہم فرض ادا کریں گے تو دوسروں کی بجائے اپنی طرف دیکھیں گے ۔ اپنا جائزہ لیں گے ۔ پہلی صورت کشمکش کی ہے ، دوسری عافیت کی ۔ مجھے تو بھئی عافیت پسند ہے ۔ تم اپنا کام کرو ۔ مجھے اپنا کام کرنے دو ۔

خاں صاحب :۔ میر صاحب آپ کو تو کوئی سمجھا نہیں سکتا ۔

میر صاحب :۔ اور نہ میں کسی کو سمجھا سکتا ہوں ۔

(دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

خاں صاحب :۔ اچھا اجازت دیجئے ۔ انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی ۔ السّلام علیکم ۔

میر صاحب :۔ وعلیکم السّلام

(خاں صاحب جاتے ہیں ۔ رابعہ بیگم آڑ سے باہر نکل آتی ہیں)

رابعہ بیگم :۔ تم ایسے ہی فرشتے تھے تو پھر آخر آل اولاد کے جھنجھٹ میں کیوں پھنسے ۔ تمہاری اور خاں صاحب کی ساری باتیں میں نے سُن لی ہیں ۔

میر صاحب :۔ بہت اچھا کیا ۔ دراصل یہ باتیں میں تم ہی کو سُنانا بھی چاہتا تھا تم نے زندگی بھر میرا ساتھ دیا ہے ۔ زندگی کے اس آخری مرحلہ پر مجھے تمہاری رفاقت کی بہت زیادہ ضرورت ہے ۔ سچ کہو کیا اس مرحلہ پر

تم میرا ساتھ نہ دوگی۔

رابعہ بیگم :۔ (آبدیدہ ہوکر) کیسی باتیں کر رہے ہو تم!

میر صاحب :۔ تم جانتی ہو یہ بوڑھا سر کبھی کسی کے سامنے نہیں جھکا۔

رابعہ بیگم :۔ ہاں جانتی ہوں۔ میں نہ جانوں گی تو کون جانے گا؟

میر صاحب :۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کبھی کسی کی مدد قبول نہیں کی۔

رابعہ بیگم :۔ ہاں خوب معلوم ہے۔

میر صاحب :۔ پھر کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ان ناموافق حالات کے سامنے سر جھکا دوں گا۔ لوگوں سے امداد و اعانت کی بھیک مانگوں گا۔ مر جاؤں گا۔ لیکن یہ نہیں کروں گا۔

رابعہ بیگم :۔ خدا نہ کرے بار بار مرنے جینے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔

میر صاحب :۔ پھر میرا ساتھ دو۔ اِس مصیبت کے دَور میں صرف تم ہی ایک ہستی ہو جو میرا حوصلہ بڑھا سکتی ہے جس سے مجھے زندگی کی نئی رمق مل سکتی ہے۔ میں کوئی کام ایسا نہیں کروں گا جس سے میری آن میں فرق آئے۔ میں خدا پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ میرا یہ عقیدہ ہے اس کا کوئی کام حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ دُکھ کو سُکھ سے بدل سکتا ہے، اور بدلے گا۔ رات کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی ضرور نمودار ہوتی ہے۔ گھنگھور گھٹاؤں کے طوفان کے بعد

سُورج اپنی چمک دمک ضرور دکھاتا ہے۔ خزاں کے موسم میں پھُول مُرجھا جاتے ہیں، پتّیاں جھڑ جاتی ہیں، کونپلیں سُوکھ جاتی ہیں۔ لیکن جب بہار کا موسم آتا ہے تو پھُول پھر کھلنے لگتے ہیں۔ پتّیاں ہری بھری ہو جاتی ہیں۔ کونپلوں میں پھر زندگی کی ہریالی آجاتی ہے۔ ——— ہماری یہ فصل خزاں بھی موسم بہار سے بدلے گی۔ ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مُرجھائے ہوئے پھُول بھی کھلیں گے۔ لیکن ہمیں ہراساں نہ ہونا چاہیئے۔ بد دل نہ ہونا چاہیئے۔ مایوس ہونا چاہیئے ہر نئی مصیبت پر میری زبان سے صرف ایک ہی بات نکلتی ہے۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ۔ یعنی خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اگر خدا سے مایوس ہو گئے تو بیشک ہمارا ٹھور ٹھکانہ پھر کہیں نہیں۔ اور اگر اس کی رحمت ہمارے ساتھ ہے تو ہر مصیبت راحت کا پیام بن کر ہمارے پاس آئے گی۔ میں ہر حالت میں خوش رہنا چاہتا ہوں اپنا حوصلہ بلند رکھنا چاہتا ہوں۔

رابعہ :۔ تو میں کب منع کرتی ہوں خوش رہنے سے تمہیں خوش رکھنے میں اگر میری زندگی بھی کام آجائے۔ اللہ جانتا ہے مجھے ذرا دریغ نہ ہوگا۔

میر صاحب :۔ نہیں مجھے تمہاری زندگی کی نہیں، تمہاری ضرورت ہے۔

رابعہ :۔ البتہ۔ بچّوں کو دیکھ دیکھ کر کلیجہ ہولتا ہے۔ زینت اللہ رکھے جوان

ہونے کو آئی۔ محمود کو ابھی بہت کچھ پڑھنا ہے۔ اختر کی ذمّہ داری بھی ہم لے چکے ہیں۔ اُسے بھی لکھانا پڑھانا ہے۔ یہ سب سوچ کر جب میں آگے کی طرف دیکھتی ہوں تو اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ مجھے اپنی ذرا بھی فکر نہیں۔ فکر جو کچھ ہے انہی بچّوں کی ہے۔

میر صاحب:۔ مجھے بھی ان کی کم فکر نہیں ——— میں بھی یہ چاہتا ہوں کہ محمود اور اختر بہترین اور اعلےٰ تعلیم حاصل کریں۔ میری خواہش ہے کہ زینت کا بیاہ اپنے حوصلہ کے مطابق کروں۔ لیکن ہم جس دور سے گذر رہے ہیں، اس میں اپنے لاکھوں بھائیوں کی طرح ہمیں اپنی تمنّاؤں کو مختصر کرنا پڑے گا۔ یہ مصیبت صرف مجھ پر اور تم پر نہیں پڑی ہے اور بھی لاکھوں آدمی ہیں جو ہم سے تم سے کہیں زیادہ پریشان حال اور آشفتہ روزگار ہیں۔ اگر اُن پر ایک نظر ڈالو تو ماننا پڑے گا کہ خدا نے ہمیں

سو سے بُرا تو لاکھ سے بہتر بنا دیا

نہ جانے کتنے ہیں جنھیں روکھی روٹی بھی میسّر نہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو اپنے لڑکوں کو پڑھا نہیں سکتے۔ اُن سے مزدوری کرانے پر مجبور ہیں۔ اَن گنت لڑکیاں ہونگی جن کی پہلی زندگی زینت سے زیادہ راحت و آرام سے گذری ہوگی اور آج وہ تمہاری زینت سے

بھی بدتر حالت میں ہوں گی۔ میں جب یہ باتیں سوچتا ہوں تو مُنہ سے شکایت نہیں، کلمۂ شُکر نکلتا ہے۔

رابعہ :۔ ہاں ہے تو ٹھیک۔

میر صاحب :۔ تم ہی سوچو ——— میں صرف ایک بات چاہتا ہوں۔

رابعہ :۔ کون سی بات ؟

میر صاحب :۔ یہ کہ ہماری ہجرت بے داغ رہے۔

رابعہ :۔ کیا مطلب ——— ہجرت میں داغ کون سا لگا ہے ؟ یہ کیا بات کہہ دی ہے ؟

میر صاحب :۔ ایک ہماری ہجرت ہے۔

رابعہ :۔ اور دوسری ؟

میر صاحب :۔ اوّ ایک ہجرت وہ تھی جو آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے اللہ کے مقبول بندوں نے کی تھی۔

رابعہ :۔ وہ کیسی تھی ؟

میر صاحب :۔ میں مہاجر ہوں۔ لیکن میرے ساتھ تم ہو، میری لڑکی ہے، میرا لڑکا ہے۔ کچھ تھوڑا بہت سامان بھی ہے۔ یہاں آنے کے بعد ہم ہجرت کرنے والوں کو حسب گنجائش اور حسب امکان مکان بھی ملتے ہیں۔ کھیت بھی ملتے ہیں۔ روزگار دلانے والے دفتر سے

بے روزگاروں کو ملازمتیں بھی ملتی ہیں۔

رابعہ :۔ تم تو اپنا قصہ لے کر بیٹھ گئے۔

میر صاحب :۔ اور ایک ہجرت وہ تھی کہ مکہ سے جب مہاجرین چلتے تھے تو اُن کا سامان چھین لیا جاتا تھا۔ اُن کی بیویاں، لڑکیاں، بہنیں روک لی جاتی تھیں۔ اُن کا اثاثہ ضبط کر لیا جاتا تھا۔ وہ اِن سب تکلیفوں کا مُسکرا کر خیر مقدم کرتے ہوئے مدینہ پہنچتے تھے۔ اور رضائے الٰہی کے خیال سے ہر دُکھ اور مصیبت کو بھول جاتے تھے۔ وہ محنت کرتے تھے۔ مزدوری کرتے تھے، مشقت کرتے تھے۔ اور اس حالت میں بھی اپنے جیسے دوسرے مصیبت زدوں کی مدد کرتے تھے۔ اور جب وہ فاتح بن کر مکّہ پہنچے تو اپنے رسول کے کہنے سے اُنہوں نے اپنی چھوڑی ہوئی چیزیں ـــــ مکان، دُکان، اثاثہ سب کچھ ـــــ اُنہی لوگوں کو بخش دیا جنہوں نے اُن پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا۔ اور جس طرح مکّہ چھوڑ کر مدینہ میں بغیر کسی ظاہری سہارے کے نئی زندگی شروع کی تھی، اُسی طرح مدینہ سے مکّہ واپس آ کر بھی انہوں نے بغیر کسی سہارے کے محض رحمتِ خداوندی اور اپنے دست و بازو کی قوت کے بل پر نئی زندگی تعمیر کرنا شروع کر دی۔

رابعہ :۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) اللہ اللہ!!

میر صاحب :۔ اور جانتی ہو اس بے داغ مہاجرت اور خالص کردار کا انجام کیا ہوا ؟

رابعہ :۔ میں کیا جانوں ، تم ہی بتاؤ ۔

میر صاحب :۔ (ذرا جوش سے) انجام یہ ہوا کہ وہی لوگ جو کچھ نہ تھے ، سب کچھ بن گئے ۔ جو مکّہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے اُنہوں نے نہ صرف مکّہ فتح کر لیا ، بلکہ وہاں سے اُٹھے تو وقت کی سب سے بڑی بادشاہت کا تختہ اُلٹ دیا ۔ وقت کی سب سے زیادہ مہذب اور متمدن حکومت ایران کا تختہ اُلٹ دیا ۔ ان کی فوجیں بربر اور افریقہ میں پہنچیں ۔ انہوں نے مصر فتح کیا ۔ سان کا پرچم اندلس پر لہرایا ۔ اُنہوں نے چین پر فاتحانہ یلغار کی ۔ اُنہوں نے افغانستان میں ایک خدا کا کلمہ بلند کیا ۔ اُنہوں نے قسطنطنیہ پر اپنا جھنڈا لہرایا ۔ اُنہوں نے ہندوستان کے علاقے جیت لئے اور جس سرزمین پر ہم بیٹھے باتیں کر رہے ہیں ، یہ انہی کے ایک سترہ (۱۷) سالہ سپہ سالار محمد بن قاسم کی فتح کی ہوئی ہے ۔ اور جب سے آج تک یہاں کی فضائیں تکبیر کے نعروں سے مانوس ہیں ۔

رابعہ :۔ اُن کی کیا بات ہے ۔ وہ اللہ کے مقدس بندے تھے ۔

میر صاحب :۔ اِنسان ماں کے پیٹ سے برگزیدگی لے کر نہیں آتا ۔ اس

کا عمل اس کا کردار۔ اُس کا ایثار، اُسے برگزیدہ بناتا ہے ——
برگزیدگی کا راستہ ہمارے لئے بھی کھُلا ہے۔ اور ہمیں دعوت دے
رہا ہے کہ ہم اُس پر چلیں، اُس کی طرف بڑھیں۔ اُسے اپنی منزلِ
مقصود قرار دیں۔

رابعہ :۔ خدا وہ دن کرے۔

میر صاحب :۔ ہمت نہ ہارو، حوصلہ بلند رکھو، وہ دن آئے گا اور جلد آئیگا
جب اس طرح مہاجرت کا انعام بندوں کی طرف سے نہیں خدا کی
طرف سے ہمیں ملے گا۔

رابعہ :۔ آمین۔

میر صاحب :۔ ارے بھئی سُنا تم نے؟

رابعہ :۔ کون سی خوش خبری لائے ہو؟ کہیں کوئی نوکری مل گئی اچھی سی؟

میر صاحب :۔ لاحول ولا قوۃ۔ سارا مزا کرکرا کر دیا تم نے۔

رابعہ :۔ کیا ہوا۔ ذرا میں بھی تو سُنوں وہ خوش خبری۔

میر صاحب :۔ اسکول کا نتیجہ شائع ہو گیا۔

رابعہ :۔ ہاں تو پھر؟

میر صاحب :۔ تمہارے صاحبزادے اپنے درجہ میں اوّل آئے ہیں ——

رابعہ :۔ اے سچ ؟

میر صاحب :۔ ہاں بھئی بالکل سچ !

رابعہ :۔ تعجب ہے یہ کھلنڈرا لڑکا اوّل کیسے آگیا ؟

میر صاحب :۔ نہیں جی۔ یہ نہ کہو۔ وہ پڑھنے کے وقت پڑھتا ہے، کھیلنے کے وقت کھیلتا ہے۔ اور یوں بھی ذہین ہے۔

رابعہ :۔ اور اختر کا کیا ہوا ؟ وہ بھی تو اسی اسکول میں پڑھتا ہے۔

میر صاحب :۔ وہ بھی اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہے، بڑا ہونہار بچّہ ہے۔

رابعہ :۔ ہاں بہت ـــــ بے زبان اور محنتی۔

رابعہ :۔ اب محمود کو انعام دینا پڑے گا تمہیں ـــــ اے لو بڑی عمر ـــ وہ آبھی گیا آؤ بٹیا آؤ۔ کہو پاس ہوگئے ؟

محمود :۔ اپنے درجہ میں اوّل آیا ہوں اماں ہاں !

رابعہ :۔ شاباش ـــــ اب تمہیں انعام ملے گا۔

محمود :۔ کیا انعام دیجئے گا ؟

رابعہ :۔ تم کیا لوگے ؟

محمود :۔ میں تو سائیکل لوں گا۔

رابعہ :۔ نوج ـــــ میں تو کبھی نہ لینے دوں گی سائیکل۔

محمود :۔ کیوں اماں ـــــ روز پیدل جانا پڑتا ہے اسکول اِتنی دُور۔ میں

تو سائیکل ہی لوں گا۔

رابعہ :۔ نا بیٹے۔ مجھے سائیکل کے خیال سے ہول آتا ہے۔ ہر روز نہ جانے کتنے حادثے ہوتے رہتے ہیں۔

محمود :۔ بڑی احتیاط سے چلایا کروں گا۔ میری اماں نہیں۔

میر صاحب :۔ بیٹے ضد نہیں کرتے۔ سائیکل واقعی خطرناک چیز ہے تمہیں اور کوئی اچھا سا انعام ملے گا۔

رابعہ :۔ کئی دن سے نصیب دشمناں محمود کی طبیعت خراب ہے۔

میر صاحب :۔ ہاں بہت کمزور ہو گیا ہے۔

رابعہ :۔ دو ایک روز اور دیکھو۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔

خاں صاحب :۔ ارے بھئی میر صاحب۔ آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔ آج اتنے دنوں کے بعد ملاقات ہوئی وہ بھی بازار میں۔

میر صاحب :۔ ہاں خاں صاحب! ان دنوں بہت پریشان رہا۔

خاں صاحب :۔ خیریت تو ہے سب؟

میر صاحب :۔ اور تو سب کچھ ہے وہی نہیں۔

خاں صاحب :۔ یعنی ——— بیمار ہے کوئی خدانخواستہ؟

میر صاحب :۔ جی ہاں۔ محمود کچھ ایسا پڑا ہے کہ اب تو مجھے اس کی زندگی خطرے میں نظر آ رہی ہے۔ خدا خیر کرے۔

خاں صاحب :۔ آخر کیا بیمار ہے وہ ؟

میر صاحب :۔ کوئی صحیح تشخیص نہیں ہو سکی اب تک۔ لیکن مرض ہے کہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اور مریض ہے کہ گھلتا چلا جا رہا ہے۔

خاں صاحب :۔ علاج کس کا ہے ؟

میر صاحب :۔ یہیں اپنے پڑوس میں ایک حکیم صاحب بچارے بڑے شریف آدمی ہیں۔

خاں صاحب :۔ وہ تو میں نے مانا کہ شریف ہیں۔ لیکن حکیم کیسے ہیں ؟

میر صاحب :۔ اپنے مقدور بھر تو بڑی توجہ سے علاج کرتے ہیں۔

خاں صاحب :۔ میرے خیال میں تو آپ ڈاکٹری علاج کرائیے یا پھر کوئی اور حکیم تلاش کیجئے۔

میر صاحب :۔ موجودہ حالات میں دونوں باتیں ناممکن ہیں۔

خاں صاحب :۔ یہ کیوں بھئی ؟

میر صاحب :۔ نیا حکیم ہو یا کوئی ڈاکٹر، دونوں میں سے جو بھی علاج کرے گا فیس بھی لے گا اور دوا کی قیمت بھی۔ اور یہاں وہی مثل ہے کہ ـــــ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ یہ بیچارے حکیم صاحب چار آنے روز

سے زیادہ کا نسخہ نہیں لکھتے۔ ان کا معاملہ بخیہ رہا ہے۔

خاں صاحب :۔ اور پرہیز ــــــ ؟

میر صاحب :۔ میرے تجربہ میں فاقہ سے بڑھ کر کوئی پرہیز ہے نہیں۔

خاں صاحب :۔ اماں سٹھیا گئے ہو کیا ــــــ ؟ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ فاقہ کرا کرا کے لڑکے کی جان لینے کا ارادہ ہے ؟

میر صاحب :۔ ارادہ اور مشیت تو صرف خدا کے لئے ہے۔ ہم کیا اور ہمارا ارادہ کیا ؟

خاں صاحب ۔ اچھا چھوڑیئے یہ بحث ۔

میر صاحب :۔ بہت اچھا۔ السّلام علیکم۔

خاں صاحب :۔ ارے ارے سُنئے تو !

میر صاحب :۔ فرمایئے ۔

خاں صاحب :۔ میرے پاس یہ سو روپے فالتو رکھے ہیں۔ ان سے کام چلایئے پھر دیکھا جائے گا۔

میر صاحب :۔ شکریہ ۔ میں یہ روپے نہیں لے سکتا۔

خاں صاحب :۔ میاں یاروں سے بھی آن دکھا رہے ہو۔ ہم تم بچپن کے کھیلے ہوئے ہیں۔ ہم سے کیا تکلف ۔

میر صاحب :۔ تعجب ہے ، پھر بھی آپ نے میرے مزاج اور طبیعت کو نہیں پہچانا۔

خاں صاحب :۔ نہیں پہچانا تھا تو اب پہچان لیا ـــــ بھائی یہ قرض دے
رہا ہوں۔ دے دینا جب چاہنا۔

میر صاحب :۔ قرض کس برتے پر لوں ؟ ـــــ یا تمہیں دھوکہ دوں گا
یا اپنے آپ کو۔

خاں صاحب :۔ اچھا قرض حسنہ سمجھ لیجئے۔

میر صاحب :۔ ہاں ٹھیک ہے، لیکن میں اپنے تئیں مستحق نہیں سمجھتا۔

خاں صاحب :۔ توبہ ہے بھئی کس قسم کے آدمی ہو.... میر صاحب، کسی
پہلو مانتے ہی نہیں ـــــ اچھا ایک بات تو مان لو۔

میر صاحب :۔ کون سی بات ؟

خاں صاحب :۔ صبح آٹھ بجے میں تمہارے یہاں پہنچ جاؤں گا۔ ہسپتال
چلنے کے لئے تیار ملنا۔ وہاں کا ڈاکٹر میرا دوست ہے۔ داخلہ کرلیگا۔
محمود کا۔ وہاں دیکھ بھال بھی اچھی ہوگی۔ اور علاج بھی زیادہ قاعدے
کے ساتھ ہوگا ـــــ بولو ملو گے تیار ؟

میر صاحب :۔ ضرور تیار ملوں گا۔

خاں صاحب :۔ (جل کر) شکریہ آپ کی اس نوازش کا۔ السّلام علیکم

میر صاحب :۔ وعلیکم السّلام۔

خاں صاحب :۔ ارے بھئی میر صاحب !

میر صاحب :۔ آیا بھئی آیا۔

خاں صاحب :۔ یہ وکٹوریہ کھڑی ہے۔ محمود کو لے آؤ اندر سے۔

میر صاحب :۔ محمود کو تو لے آؤں، لیکن اس کے ساتھ اختر بھی چلے گا۔

خاں صاحب :۔ اختر ؟ کیا ہوا اُسے ؟

میر صاحب :۔ رات سے وہ سخت نمونیہ میں مبتلا ہے۔

خاں صاحب :۔ نمونیہ میں ؟

میر صاحب :۔ ہاں ـــــ اور بہت بے چین ہے۔

خاں صاحب :۔ اچھا لے آؤ۔ اُسے بھی لے چلو۔

میر صاحب :۔ ابھی آیا !

(وکٹوریہ کے چلنے کی آواز)

خاں صاحب :۔ کہیئے ڈاکٹر صاحب، آپ نے دونوں لڑکوں کا معائنہ کر لیا۔

ڈاکٹر :۔ جی ہاں ـــــ دونوں کی حالت تشویش انگیز ہے۔ یکساں طور پر خطرہ دونوں کے سر پر منڈلا رہا ہے۔

خاں صاحب :۔ پھر اب کچھ نہیں ہو سکتا ؟

ڈاکٹر :۔ ہم کوشش کر سکتے ہیں، نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

خاں صاحب :۔ تو داخل کر لیجئے، دونوں کو۔

ڈاکٹر :۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں صرف ایک بستر خالی ہے۔ لہٰذا ایک ہی کا داخلہ ہو سکتا ہے۔

خاں صاحب :۔ اور دوسرا؟ دوسرے کا کیا ہوگا؟

ڈاکٹر :۔ یا گھر لے جائیے۔ یا کسی دوسرے ہسپتال میں کوشش کیجئے۔

خاں صاحب :۔ اچھا، تو دونوں میں جو بڑا لڑکا ہے اُسے داخل کیجئے۔ دوسرے کو ہم لئے جاتے ہیں۔

میر صاحب :۔ نہیں ـــــ چھوٹے کو داخل کیجئے، بڑا واپس جائے گا۔

ڈاکٹر :۔ جیسا کہئے، مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے؟

خاں صاحب :۔ میر صاحب، میر صاحب!

میر صاحب :۔ بھئی اس معاملے میں کچھ نہ کہئے خاں صاحب۔ اختر یہاں رہے گا۔ محمود کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

رابعہ :۔ تم محمود کو تو واپس لے آئے، میرا بچہ اختر کہاں رہ گیا؟

میر صاحب :۔ اُس کی حالت زیادہ خطرناک تھی۔ اُسے ہسپتال میں داخل کر دیا۔

رابعہ :۔ محمود کے بارے میں ڈاکٹر نے کیا کہا؟

میر صاحب :۔ دوا دی ہے۔ نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

رابعہ :۔ ہائے میرا دل دھڑک رہا ہے۔ زور زور سے۔ نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے ؟

(رونے لگتی ہے)

میر صاحب :۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ تمہارے رونے سے محمود کیا سمجھے گا ؟

رابعہ :۔ خدا کے لئے بتا دو، ڈاکٹر نے کیا کہا ؟ کچھ زیادہ خطرہ تو نہیں ہے میرے بچے کے لئے۔

میر صاحب :۔ خطرہ بہرحال خطرہ ہے، خواہ وہ زیادہ ہو یا کم، آنسو پونچھ ڈالو۔ وضو کرو اور خدا سے گڑگڑا کر اس کی صحت کے لئے دعا مانگو۔ دکھی دلوں کی پکار اُس تک فوراً پہنچتی ہے۔ میں بھی مسجد جا رہا ہوں۔

حکیم صاحب۔ کیا حال ہے محمود کا ؟

میر صاحب :۔ رات سے غفلت میں پڑا ہے حکیم صاحب، چلئے ذرا دیکھ لیجئے چل کر۔ اُس کی ماں بہت بے قرار ہو رہی ہے۔ بہن کی بھی روتے روتے آنکھیں سوج گئی ہیں۔

حکیم صاحب :۔ چلئے ——————

میر صاحب :۔ کیوں بیٹا اختر! اب طبیعت ٹھیک ہے بالکل۔ یہاں ہسپتال

میں جی تو نہیں گھبراتا ؟

اختر :۔ اب تو اچھا ہوں، ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کل ہسپتال سے چھٹی مل جائیگی تمہیں۔

میر صاحب :۔ کل ہم آکر تمہیں لے جائیں گے۔

اختر :۔ محمود بھیا کیسے ہیں ؟

میر صاحب :۔ اچھے ہیں، تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔

میر صاحب :۔ ارے خاں صاحب آپ اس وقت یہاں کہاں ؟

خاں صاحب :۔ آپ کہاں غائب تھے اتنی دیر سے ؟

میر صاحب :۔ ہسپتال گیا تھا، اختر کے پاس۔ اب اچھا ہے کل آجائے گا۔

خاں صاحب :۔ آپ اندر آجائیے، فوراً ——— !

میر صاحب :۔ ہاں جارہا ہوں، کوئی خاص بات ؟

(اندر سے رونے کی آواز، ہلکی ہلکی)

(میر صاحب اندر آتے ہیں)

زینت :۔ ابا محمود ! (رونے لگتی ہے)

رابعہ :۔ میرا بچہ ! (رونے لگتی ہے)

میر صاحب :۔ (وقار کے ساتھ) اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

(سسکیوں کی آوازیں جاری ہیں)

مساواتِ اسلامی

کردار

ہارون رشید ..... خلیفۃ المسلمین

یحییٰ ..... خلیفہ کا وزیر اعظم

ربیع ..... خادم

ابوالعتاہیہ ..... درباری شاعر

مسرور ..... خلیفہ کا خادم خاص

درباری ۔ مصاحب ۔ لونڈی ۔ حاجب

وغیرہ

آج جُمعہ کا دن ہے۔ بغداد کی خلقت جامع مسجد کی طرف اُمڈی چلی آرہی ہے۔ آج امیرالمومنین، خلیفتہ المسلمین، ظل اللہ فی الارض ہارون الرشید امامت کے فرائض انجام دیں گے۔ اور خطبۂ جُمعہ ارشاد فرمائیں گے۔

ہارون الرشید: مُسلمانو! تم نے جس جوش وخروش سے میری خلافت پر بیعت کی ہے اُس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نے اپنے نفس اور ضمیر سے مشورہ کیا، پھر یہ گراں بار ذمہ داری قبول کرلی۔ میں نے عزائم کو پرکھا اور ارادوں کو تولا اور فیصلہ کرلیا کہ خدا کی نُصرت فرمائی کے بھروسہ پر عدل وانصاف، امانت ودیانت اور حق وصداقت کے ساتھ اپنی منصبی ذمہ داریاں انجام دینے کی کوشش کرونگا۔ یاد رکھو میں نرم بھی ہوں اور سخت بھی، جو نرمی کے سزاوار

ہیں اُن پر ظلم و تعدّی نہ کروں گا۔ جو سزا اور تعزیر کے مستحق ہیں اُن سے میرا انصاف رحم نہ کرے گا۔ ہم سب کی رہنمائی کے لئے خدا کا کلام اور رسول کی سنّت کافی ہے۔ اگر میں غلط راستے پر چلوں تو تمہیں حق ہے کہ مجھے ٹوک دو۔ اگر بدعت کا طریقہ اختیار کروں تو تمہارا فرض ہے کہ مجھے آگے بڑھنے سے روکو۔ اور پیچھے دھکیل دو۔ ظلم کروں تو میرا ہاتھ پکڑ لو۔ کتاب و سنّت کے خلاف کہوں تو میری زبان کاٹ لو۔

ایک اعرابی :۔ امیرالمومنین! امیرالمومنین!!

حاجب :۔ بے ادب۔ خاموش!

اعرابی :۔ تم کون ہو؟ میں نہیں جانتا۔ میں امیرالمومنین تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں۔ وہ سُنیں گے۔ اُنھیں سُننے دو۔

ہارون :۔ ہاں میں سُنوں گا۔ اے شخص تو کون ہے؟ اور کیا چاہتا ہے؟

اعرابی :۔ میں ایک مسلمان ہوں اور صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔

ہارون :۔ کہو کہو۔ تمہیں اجازت ہے۔ پوری آزادی سے جو کہنا چاہتے ہو کہہ سکتے ہو۔

اعرابی :۔ ہاں، میں ضرور کہوں گا۔ اور اگر میں نے اپنے دل کی بات نہ کہی تو مجھ سے بڑھ کر خطا کار کوئی نہ ہوگا۔

ہارون :۔ لیکن تم کہتے کیوں نہیں ؟

اعرابی :۔ ہم نے اخلاص نیّت کے ساتھ آپ کی خلافت پر بیعت کی ہے۔

ہارون :۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ تم سچ کہتے ہو۔

اعرابی :۔ ہم نے بیعت کی ہے کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے۔ آپ کے حکم کی سرتابی نہ کریں گے۔ آپ کے ایک اشارے پر اپنی گردنیں کٹا دیں گے۔ آپ کے دشمنوں سے مقابلہ کریں گے۔ لڑیں گے۔ اُنھیں قتل کر دیں گے۔ لیکن ——————

ہارون :۔ (شفقت کے ساتھ) ہاں ہاں کہو۔ تمہاری باتوں میں صداقت اور اخلاص کا رنگ جھلکتا ہے۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے بے جھجک کہہ ڈالو۔

اعرابی :۔ لیکن کیا آپ نے بھی خدا سے کچھ عہد کیا ہے ؟

ہارون :۔ کیا مطلب ؟

اعرابی :۔ (بلند آواز سے) میں پوچھتا ہوں اے خلیفہ کیا تو نے بھی خدا سے کچھ عہد کیا ہے ؟ اگر نہیں کیا ہے تو اب کر —— ہمیں گواہ بنا کر خدا سے اقرار کر کہ اگر تیرے حکّام و عمّال ہم پر ظلم کریں گے تو تو اُنہیں سزا دے گا۔ اگر تیری اِس وسیع مملکت میں کوئی مسلمان رات کو بھوکا سوئے گا تو تیرے حلق کے نیچے بھی لقمہ نہیں اُترے

پائے گا۔

ہارون :۔ (گلوگیر آواز میں) ہاں میں اس کا اقرار کرتا ہوں۔

اعرابی :۔ یا امیر المومنین! تیرا مسکن صرف قصرِ خلافت نہیں، حرمِ سلطانی نہیں۔ تجھے پا پیادہ چل کر جھونپڑیوں تک بھی آنا ہوگا۔ تنگ و تاریک مکانوں کے مکیں بھی تیری خبر گیری سے محروم نہ رہ سکیں گے۔

ہارون :۔ (گلوگیر آواز میں) ہاں میں یہ بھی کروں گا۔

اعرابی :۔ تیرا یہ فرض بھی ہے کہ کون آسودہ حال ہے اور کون آشفتہ روزگار۔

ہارون :۔ ہاں یہ میرا فرض ہے۔ اور اس فرض کو میں انجام دوں گا ــــ میں دن کو دربار کروں گا۔ اور رات کے سناٹے میں بہ چشمِ خود حالات کا معائنہ اور مشاہدہ کرنے کے لئے گشت پر نکلوں گا۔

اعرابی :۔ مجھے یقین ہوگیا تو خدا سے ڈرتا ہے۔

ہارون :۔ ہاں میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ دُنیا فانی ہے۔ یہ اقتدار و اختیار عارضی ہے۔ یہ عیش و عشرت کی گھڑیاں مختصر ہیں جس طرح سب مرتے ہیں میں بھی مروں گا۔ مرنے کے بعد اس زمین کے نیچے عام لوگوں کی طرح مجھے بھی دفن ہونا پڑے گا اور پھر ــــ اور پھر ــــ

(آواز مرتعش ہو جاتی ہے)

اور پھر احکم الحاکمین رب العالمین، خدائے قادر و توانا کے دربار میں حاضر ہو کر، ایک ایک عمل کا مجھے حساب دینا پڑے گا ـــــ میرے دوست! میں تمہارا شکر گذار ہوں کہ تم نے بڑے موقع سے ٹوکا۔ اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے

(اذانِ اقامت کی آواز)

ہارون الرشید تختِ خلافت پر متمکن ہو چکا ہے۔ لیکن اب تک اُس نے اپنا وزیر اعظم کسی کو منتخب نہیں کیا ہے۔ لوگوں میں چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں۔ لوگ اشتیاق اور بے تابی کے ساتھ نئے وزیرِ اعظم کا نام سُننے کے منتظر ہیں۔

آج رات کو پرائیویٹ مجلس میں خلیفہ نے ارباب حل وعقد کو بُلایا ہے کہ اُن سے صلاح و مشورہ لے کر نئے وزیرِ اعظم کا انتخاب کرے۔

ہارون :۔ آپ حضرات سمجھ گئے ہونگے، میں نے آپ کو کس لئے زحمت دی ہے

درباری :۔ شاید امیر المومنین کسی خاص امر میں ہم دیرینہ صلاح کاروں سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں؟

ہارون :۔ یہی بات ہے۔

درباری :۔ وہ کون سا مسئلہ ہے جو امیر المومنین کے زیر غور ہے ؟

ہارون :۔ وزیر اعظم کا انتخاب۔

درباری :۔ خود امیر المومنین کی نگاہِ انتخاب بھی تو کسی پر پڑی ہوگی ؟

ہارون :۔ میں آپ کی رائے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

درباری :۔ میری رائے میں فضل بن ربیع سے زیادہ موزوں ——

ہارون :۔ اس نام پر میں غور کر چکا ہوں۔

درباری :۔ مگر امیر المومنین کی نگاہِ انتخاب میں نہ جچ سکا ؟

ہارون :۔ ہاں یہی بات ہے —— بعض مصالح کے ماتحت فضل بن ربیع کو میں اس کا اہل نہیں سمجھتا۔

درباری :۔ تو پھر کوئی اور عرب سردار ——

ہارون :۔ میں یحییٰ برمکی کو یہ منصب سونپنا چاہتا ہوں۔

ایک درباری :۔ (حیرت سے) یحییٰ برمکی ؟

دوسرا درباری :۔ وہ یحییٰ —— برمکی ؟

ہارون :۔ ہاں وہی۔ اگر اس میں کوئی نقص ہو تو فرمائیے۔ پھر میں اپنی رائے پر اصرار نہیں کروں گا۔

دوسرا درباری :۔ کوئی خاص نقص تو نہیں امیر المومنین۔

ہارون :۔ پھر بھی اگر کچھ ہو تو فرمائیے۔ میں سنوں گا۔ غور کروں گا۔

تیسرا درباری :۔ وہ نومسلم ہے۔

چوتھا درباری :۔ وہ ایرانی ہے۔

پانچواں درباری :۔ وہ عرب سے دُور کا تعلق بھی نہیں رکھتا۔

چھٹا درباری :۔ وہ ——————

ہارون :۔ (غضب ناک آواز میں) پھر سے کہیئے۔ کیا کہا آپ نے؟

تیسرا درباری :۔ وہ نومسلم ہے۔

ہارون :۔ لہٰذا اس کی تالیفِ قلب ضروری ہے —— اور آپ نے کیا کہا تھا؟

چوتھا درباری :۔ یہ کہ وہ ایرانی ہے۔

ہارون :۔ ہاں وہ ایرانی ہے۔ لیکن پہلے مسلمان ہے۔ پھر ایرانی ——
اور آپ کیا کہنا چاہتے تھے؟

چھٹا درباری :۔ وہ ——————

ہارون :۔ اسلام نسل و قوم، خاندان اور وطن کا امتیاز نہیں تسلیم کرتا۔
بے شک اِسلام سے پہلے دُنیا نے پست و بلند کا امتیاز قائم کیا تھا۔
لیکن اِسلام نے اِس غیر فطری حصارِ نسب اور حسب کی اینٹ سے
اینٹ بجا دی۔ کیا تم نہیں جانتے حضرت سلمان فارسیؓ جب اُن کا
حسب نسب دریافت کیا گیا تو اُنہوں نے کیا جواب دیا تھا —— ؟
اُنہوں نے کہا تھا سلمان ابن اسلام۔ ابن اسلام —— اِسلام

نے اِسلامی اخوت اور مساوات کی قومیت قائم کردی ہے۔ کیا
اِس کے بعد بھی کسی امتیاز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔؟

پہلا درباری :۔ ہرگز نہیں یا امیرالمومنین۔

دوسرا درباری :۔ حجاب کے پردے ہماری آنکھوں پر سے اُٹھ گئے۔

تیسرا درباری :۔ ہم نے اپنی غلطی محسوس کرلی۔

ہارون :۔ ایک مُسلمان کی شان یہی ہے کہ اگر اُس سے کوئی غلطی فکر و
عقیدہ کی سرزد ہو تو کھلے دِل سے اس کا اعتراف کرلے۔
جزاک اللہ۔

حاجب :۔ یحییٰ برمکی، امیرالمومنین کے اِذنِ باریابی کا منتظر ہے!

ہارون :۔ اجازت ہے۔

یحییٰ :۔ السّلام علیکم یا امیرالمومنین۔

ہارون :۔ آؤ۔ ہم تمہارے منتظر تھے۔

یحییٰ :۔ جاں نثار حاضر ہوگیا۔

ہارون :۔ ہم نے تمہیں اپنا وزیرِ اعظم مقرر کیا ہے۔

یحییٰ :۔ امیرالمومنین ۔ امیرالمومنین۔ یہ قدر افزائی۔ یہ کرم گستری۔
یہ بندہ نوازی۔ غلام اس بارِ گراں کو نہ اُٹھا سکے گا۔

ہارون :۔ کیوں ؟ کس لئے ؟

یحییٰ :۔ جس منصب بلند پر اب تک اشرافِ عرب فائز ہوتے آئے اُس پر مجھ جیسا ——————

ہارون :۔ آخر تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو ؟ —— ہم جانتے ہیں کہ تم بہادر ہو۔ وفادار ہو۔ حکمتِ عملی، تدبر اور سیاست کے ماہر ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ہمارے مزاج شناس اور معتمد ہو۔ ہمیں تم سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا۔ یہ منصب تمہیں قبول کرنا پڑے گا۔

یحییٰ :۔ غلام کا سرِ تسلیم خم ہے۔

ہارون :۔ ہمیں تم سے یہی توقع تھی —— اور ہاں ہمیں تم سے ایک شکایت بھی ہے۔

یحییٰ :۔ شکایت ؟ اپنے جاں نثار سے شکایت ؟

ہارون :۔ ہاں تم سے —— اور بہت بڑی شکایت۔

یحییٰ :۔ تو جلاّد کو حکم دیجئے امیر المومنین کہ وہ میری گردن اُڑا دے۔

ہارون :۔ (ہلکا سا قہقہہ) نہیں نہیں۔ تمہاری گردن ہماری نظر میں اتنی ہی قیمتی ہے جتنی خود اپنی زندگی ہمیں شکایت تم سے صرف یہ ہے کہ اشرافِ عرب کا ذکر تم نے ایسے لب و لہجہ میں کیا، جس سے احساسِ کمتری جھلکتا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے، حجۃ الوداع کے خطبہ

میں جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کا آخری خطبہ تھا، آپ نے کیا فرمایا تھا ——— ؟

یحییٰ :- (کانپتی ہوئی آواز سے) امیر المومنین بہتر جانتے ہیں۔

ہارون :- حضور نے فرمایا تھا۔ عربی، عجمی پر اور عجمی عربی پر کوئی فضیلت نہیں رکھتا۔ تم سب اولادِ آدم ہو۔ اور آدم مٹّی کے پُتلے تھے۔ جس نبیؐ آخر الزماں نے اتنے صاف اور واضح الفاظ میں مساوات کی تعلیم دی ہو، اُس کا ایک پیرو اور اُمّتی اس خیالِ خام میں مبتلا نہیں رہ سکتا کہ کوئی مُسلمان کسی دوسرے مسلمان سے حسب و نسب کی بنیاد پر افضل ہے۔ یہ عقیدہ اسلام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اسلام میں بزرگی اور برتری کا معیار صرف ایک ہے اور وہ ہے تقویٰ۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ یعنی تم میں خدا کے نزدیک بزرگ و برتر وہی ہے جو سب سے زیادہ مُتّقی اور پرہیزگار ہو۔

یحییٰ :- بجا ارشاد فرمایا امیر المومنین۔

ہارون :- تو جاؤ، اپنے منصب کے فرائض ہمّت اور دلیری کے ساتھ انجام دو ——— بغداد میں آج سے ہارون الرشید کے بعد سب سے زیادہ با اقتدار اور با اختیار ہستی کس کی ہے جانتے ہو ؟

یحییٰ :۔ امیرالمومنین کے اِس کمترین خادم یحییٰ کی۔

ہارون :۔ (ہنس کر) تم نے بہت ٹھیک جواب دیا۔ تم امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ اب تم جا سکتے ہو۔

اور اس طرح ایک عجمی محض اپنی ذاتی صلاحیت اور استعداد کی بنا پر اشرافِ عرب، اعیانِ عجم اور ساری ملّتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا سردار بن گیا۔

ایک لونڈی :۔ ارے کوئی اسے ڈھونڈیو ـــ ربیع کو ـــ موا کہاں مر گیا جا کر۔

ربیع :۔ میں حاضر ہوں۔ کوئی حُکم؟

لونڈی :۔ موے تو جانتا نہیں۔ آج ہمارے ابوالقساہیہ شاعر کو اپنی مجلس شبینہ میں امیرالمومنین نے طلب فرمایا ہے۔

ربیع :۔ ہاں جانتا ہوں ـــــ یہاں سے اُن کا ردلیف بن کر قصرِ خلافت تک میں ہی تو ساتھ جاؤں گا۔

لونڈی :۔ یہ لو، پھر بھی اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا ہے ـــــ ابوالقساہیہ بڑی دیر سے تجھے یاد کر رہے ہیں۔

ربیع :۔ مجھے ؟ کیوں ؟ کس لیے ؟ ـــــ کیا کام ہے آخر ؟

لونڈی :۔ اے ہے ۔ بڑے بھولے ــــــ کچھ جانتے ہی نہیں۔ بیچارے ۔

ربیع :۔ کیوں ہلکان کر رہی ہو ۔ خواہی نخواہی کو ۔ جب دیکھو ترسایا ہی کرتی ہیں ۔ مُفت میں ۔

لونڈی :۔ اے چل مردوئے ۔ تو میرا ہوتا کون ہے جو تجھے ترساؤں گی۔ میرے مُنہ لگا ہوگا تو ایک کی دس سُنے گا ــــــ ابھی جاکر ــــ ــــ کہونگی تو چندیا گنجی ہو جائے گی ۔ اللہ قسم ایک بال جو رہے سر پر ۔

(ہنستی ہے پھر کہتی ہے)

اے میں کہتی ہوں نبیذ لے جائے گا یا نہیں ۔ نبیذ کا جام پئے بغیر وہ قدم نکالنے سے رہے ــــــ

(آہستہ سے سرگوشی کے لہجے میں)

ہائے اللہ وہ خود آ رہے ہیں ۔

(کسی کے آنے کی آہٹ ۔ دونوں سہم کر خاموش ہو جاتے ہیں)

ابو العتاہیہ :۔ ربیع !

ربیع :۔ میرے آقا !

ابو العتاہیہ :۔ ہمیں خلیفہ کی مجلس میں چلنا ہے ، دو مرتبہ ہرکارہ آ چکا ہے

کیا تم تیار ہو ؟

ربیع :۔ تیار ہوں میرے آقا ۔

ابوالقساہیہ :۔ اور نبیذ ؟

ربیع :۔ وہ بھی تیار ہے میرے آقا ۔

ہارون :۔ ابوالقساہیہ اب تک نہیں آیا ۔ اس کے بغیر مجلس سُونی لگتی ہے مسرور !

مسرور :۔ میرے مولا غلام حاضر ہے ۔

ہارون :۔ جاؤ ابوالقساہیہ کو اپنے ساتھ لے کر آؤ ——— بڑی عمر ہے تمہاری ۔ ابوالقساہیہ ۔ ہم تمہیں یاد کر رہے تھے ۔ اہلاً وسہلاً ۔

ابوالقساہیہ :۔ غلام کا فرض ہے کہ آقا کی آواز پر فوراً لبیک کہے ۔ آپ نے یاد فرمایا اور میں حاضر ہو گیا ۔

ہارون :۔ یہ دربارِ خلافت نہیں ۔ حلقۂ اخوان الصفا ہے ۔ یہاں نہ کوئی آقا ہے نہ غلام ۔ نہ سلطان ہے نہ وزیر ۔ کسی کو کسی پر تفوق نہیں ہم سب بھائی بھائی ۔ اور بے تکلف دوست ہیں ۔ یہاں نہ ادب کی ضرورت ہے ، نہ تکلف کی ۔ ہم سب آزادی اور بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے ۔ جعفر شہر کی کیا حالت ہے ؟

یحییٰ :۔ امن وامان کا ہر طرف دور دورہ ہے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ کمزور زور اور سے نہیں ڈرتا۔ زور اور کمزور پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔

ہارون :۔ مسرور تمہیں کیا معلوم ہے ؟

مسرور :۔ ہر مسلمان امیر المومنین کا ثنا خواں اور دُعا گو ہے۔

ہارون :۔ ہم لباس تبدیل کر کے گشت کو نکلنا چاہتے ہیں۔ تاکہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں لوگ کس حال میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ابوالقساہیہ :۔ بڑا مبارک ارادہ ہے امیر المومنین کا۔ لیکن قبل اس کے کہ آپ گشت پر روانہ ہوں، میں نے چند شعر کہے ہیں۔ اگر بار خاطر نہ ہو تو سماعت کی زحمت گوارا فرمائی جائے۔

ہارون :۔ ہاں ضرور۔ تمہارے اشعار اپنے اندر ایسی جاذبیت رکھتے ہیں کہ ہر کام ان کی خاطر ملتوی کیا جا سکتا ہے۔

ابوالقساہیہ :۔ عزت افزائی ہے امیر المومنین کی۔

ابوالقساہیہ نے اپنے اشعار سُنائے۔ آخر اس شعر پر پہنچا۔

خدا کرے شان و شوکت اور جاہ و جلال کے سایہ میں تیری زندگی مسرت اور شادمانی کے ساتھ بسر ہوتی رہے۔

ہارون :۔ آفریں ۔ آفریں ۔ شاباش ۔

پھر ابوالقساہیہ اس شعر پر پہنچا کہ میری دُعا ہے کہ تیری ہر خواہش اور تمنّا تصور میں آنے سے پہلے خدا مہیا کر دے ۔

ہارون :۔ مرحبا مرحبا ۔

اور پھر ابوالقساہیہ نے دو اور شعر سُنائے ۔ جب موت کا پنجہ تیری طرف بڑھے گا ۔ سانس سینہ سے اٹک اٹک کر نکلے گا تو بیکسی کے ساتھ ہاتھ پاؤں پٹکے گا اور کوئی تیری یاوری نہ کر سکے گا ۔ اس وقت تجھے احساس ہوگا ، یہ دُنیا فانی ہے ۔ یہ جاہ و حشم چھن جانے والی ہے ۔

ہارون :۔ (گریہ آمیز آواز میں) ابوالقساہیہ ۔ بس

ابوالقساہیہ :۔ اور ——————

ہارون :۔ (کانپتی ہوئی آواز میں) ابوالقساہیہ ۔ اب میں نہیں سُن سکتا ۔

ابوالقساہیہ :۔ لیکن یہ حلقہ اخوان الصفاء ہے ۔ یہاں نہ کوئی آقا ہے نہ غلام ۔ نہ وزیر نہ شہریار ۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں اور بے تکلّف دوست ہیں مُسلمان بھائی سچّے دوست ۔ ہارون ! تجھے میرا یہ آخری شعر ضرور سُننا پڑے گا ۔

ہارون :- (مدھم آواز میں) ہم سب بھائی بھائی ہیں (ٹھہر ٹھہر کر) مسلمان بھائی۔ سچے دوست (بلند آواز سے) ابوالقساہیہ! اپنا وہ آخری شعر سناؤ۔ میں سُنوں گا۔

ابوالقساہیہ :- یہ دنیا فانی ہے۔ یہ جاہ و حشم چھن جانے والی ہے۔ باقی رہنے والی، نہ مٹنے والی، نہ مرنے والی ایک چیز ہے۔ اور وہ ہے عمل صالح۔

(بلند آواز سے)

خیرے کُن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

ہارون :- ابوالقساہیہ یہ تیرے نصیحت آمیز الفاظ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

ابوالقساہیہ :- پھر امیرالمومنین کا نام نیک قیامت تک زندہ رہے گا

صدر اوّل کا دور ختم ہو چکا ہے۔ خلافت راشدہ کا عہد گزر چکا ہے۔ دراصل اُمویوں ہی کی حکومت سے۔ امامت اور خلافت کے بجائے شہنشاہیت کا آغاز ہو چکا تھا۔ عباسی عہد حکومت تو اس کے بعد آیا۔

اس دور میں غیر ملکی اثرات زیادہ ہو گئے تھے۔ اسلامی نظام مساوات واخوت کی وہ کامرانی باقی نہ رہ گئی تھی۔ جس کی مثالیں عہد رسالت اور دورِ صحابہ میں ملتی تھیں۔ پھر بھی خالص اسلامی نقطۂ نظر سے تنزل اور انحطاط کے اس دور میں بھی اسلامی مساوات اور اخوت کی وہ نادر مثالیں مل جاتی ہیں جن کی نظیر دُنیا کی تاریخ ملوکیت، تاریخ جمہوریت اور عوامیت بھی نہیں پیش کر سکتی ؎

یہ اُسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن
کھیلنے جاتے تھے ایواں گہہ کسریٰ میں شکار

حق کا فیصلہ

کردار

ہونیاڈے ..... یورپ کا مشہور سپہ سالار

لاڈسلاس .....

سُلطان مُراد ثانی ..... فرمانروائے ترکیہ

جولین ..... پاپائے روی کا نمائندہ خصوصی

کردار

ہونیاڈے ..... یورپ کا مشہور سپہ سالار

لاڈسلاس .....

سُلطان مُرادثانی ..... فرمانروائے ترکیہ

جولین ..... پاپائے روی کا نمائندہ خصوصی

کے ساتھ ایشیائے کوچک میں بغاوتوں اور شورشوں کے فرو کرنے میں مصروف تھا۔ اور ادھر یورپ کی چھوٹی اور بڑی حکومتیں سلطان مراد کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھا کر ترکی حکومت اور خاندانِ عثمان کا یورپ سے خاتمہ کر دینے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

۱۴۴۰ء میں لاڈسلاس، پولینڈ کا بادشاہ ہنگری کا بھی بادشاہ بن گیا۔ یہ بادشاہ اسلام کا مخالف ترکوں کا دشمن اور مسلمانوں کے نام سے بیزار تھا۔

ایک فوجی سردار ہونیاڈے اپنی بہادری اور ہمت کے اعتبار سے سارے یورپ میں شہرہ رکھتا تھا۔

ہونیاڈے فنون جنگ کا بہت بڑا ماہر تھا۔ بڑے بڑے میدان جیت چکا تھا۔ مضبوط سے مضبوط قلعوں کو سر کر چکا تھا۔ اُس کی دھاک سارے یورپ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ دوست اُس کے نام کا سہارا لے کر آگے بڑھتے تھے۔ اور دشمن اُس کے نام سے تھراتے تھے۔

ہونیاڈے ہنگری پہنچا۔ وہ جانتا تھا ہنگری عثمانی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے درپے تھے۔ اُس نے لاڈسلاس کے بھڑکے ہوئے جذبات کو اور زیادہ اُبھارا۔ اُس نے کہا۔

ہونیاڈے :۔ خداوند! میں نے اپنی زندگی آپ کے قدموں پر قربان کرنے

کا عہد کر لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں ہنگری پر ترکوں کی باج گذاری اور
حکومی کا جو داغ لگ گیا تھا اُسے اپنی فتح یابیوں سے مٹا دوں۔

لاڈسلاس :۔ ہم تمہارے ان جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ لیکن ترکوں کو شکست
دینا کیونکر ممکن ہے ؟

ہونیاڈے :۔ مراد ثانی ایشیائے کوچک میں اُلجھا ہوا ہے۔ اس کا مشہور سپہ سالار
قلعہ ہرمان اسٹاٹ کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ سب سے پہلے میں اسی
کی خبر لوں گا۔

لاڈسلاس :۔ یہ سچ ہے کہ مراد ایشیائے کوچک میں اُلجھا ہوا ہے لیکن شاید
تمہیں نہیں معلوم جنرل مزید ہاشا کے پاس کتنا بڑا لشکر ہے

ہونیاڈے :۔ جانتا ہوں میرے آقا! لیکن اس لشکر کے میں پرخچے اڑا دونگا

لاڈسلاس :۔ تم جانتے ہو کہ فی الحال بہت بڑا لشکر نہیں فراہم کر سکتے۔ کیا پھر
بھی تم اپنی کامیابی کا یقین رکھتے ہو ؟

ہونیاڈے :۔ جی ہاں۔

لاڈسلاس :۔ کیوں ؟

ہونیاڈے :۔ فرید پاشا کی فوج تھک چکی ہے۔ اُسے کہیں سے کمک نہیں
پہنچ سکتی۔ اس کے پاس کھانے پینے کی چیزیں کم ہیں۔ سامان جنگ
بھی تھوڑا ہے۔ ہم اس طرح سارے ناکے بند کر دینگے کہ باہر سے رسد

آسکے نہ سامان جنگ ہی پہنچ سکے۔

لاڈسلاس:۔ ہمیں تمہاری رائے سے اتفاق ہے۔

فرید پاشا نے شکست کھائی۔ وہ اور اُس کا نوجوان بیٹا گرفتار ہوئے اس لڑائی میں تقریباً پندرہ ہزار قیدی ہونیاڈے کے ہاتھ آئے تھے ان سب کو قتل کر ڈالا گیا۔ مقتولوں میں فرید پاشا اور اُس کا بیٹا بھی شامل تھے۔

سُلطان مراد نے اس شکست کی خبر سُن کر شہاب الدین پاشا کی کمان میں ایک اور فوج بھیجی۔ لیکن ہونیاڈے نے اُسے بھی شکست دی۔

ترکوں کی اِن شکستوں اور ہونیاڈے کی فتوحات نے پولینڈ اور ہنگری کے شہنشاہ لاڈسلاس کا حوصلہ بڑھا دیا۔ اُس نے طے کر لیا کہ یورپ سے ترکوں کو نکال کر باہر کر دیا جائے۔

اگرچہ اُسے ہونیاڈے پر بڑا بھروسہ تھا لیکن اتنا بڑا کام وہ تنہا کرنا نہ چاہتا تھا۔ اُس نے دوسری حکومتوں کو بھی اس کام میں شرکت کی دعوت دی۔

چنانچہ ہنگری اور پولینڈ۔ عیدل۔ وچیالا اور بوسینا کی حکومتیں بھی اپنے لاؤلشکر کے ساتھ میدان جنگ میں پہنچ گئیں۔ سرویہ جو اب تک ترکوں کا ماتحت باج گذار اور دوست تھا، اُس نے بھی ترکوں کا ساتھ چھوڑا اور نئے اتحادیوں کے ساتھ جا ملا۔

فرانس اور جرمنی نے بھی اپنی اپنی فوجیں لاڈسلاس کی خدمت میں

روانہ کیں کہ جس طرح چاہے اُنہیں ترکوں کے خلاف استعمال کریں۔

لاڈسلاس نے پوپ سے بھی دُعائے خیر و برکت مانگی تھی۔

پوپ نے دُعائے خیر و برکت کے ساتھ ساتھ ایک فوج بھی جو ضروری آلات جنگ سے مسلّح تھی بھیجی۔ اور اس فوج کا سربراہ کارجرنیل سیزارینی کو بنا کر روانہ کیا۔ اس کے علاوہ یورپ کے تقریباً ہر ملک سے رضا کار افواج بہت بڑی تعداد میں لاڈسلاس سے آکر مل گئیں۔

ان سب کا مقصد صرف یہ تھا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال دیا جائے ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ انہیں اس قابل نہ رکھا جائے۔ کہ پھر وہ سر اُٹھا سکیں۔ اور عزّت کی زندگی بسر کر سکیں۔

سب سے زیادہ اہم اور زبردست مدد حکومت وینس نے دی۔

وینس نے بہت بڑا بحری بیڑا مدد کے لئے روانہ کیا۔

جنیوا کی حکومت نے بھی اپنا بحری بیڑا لاڈسلاس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ترکوں کے پاس اس وقت تک نہ کوئی بحری بیڑا تھا، نہ بحری فوج۔ لہٰذا اطمینان تھا کہ سلطان مُراد ثانی ایشیائے کوچک سے اپنی خاص فوجیں مقابلہ کے لئے نہیں روانہ کر سکتا۔ یورپین ممالک کی ان بری اور بحری فوجوں کا سپہ سالار اعلیٰ بظاہر پولینڈ اور ہنگری کا شہنشاہ لاڈسلاس تھا۔ لیکن حقیقتاً ان افواج کی کمان ہونیاڈے کے ہاتھ میں تھی۔

۱۴۴۳ء میں عیسائیوں کے اس بہت بڑے لشکر نے دریائے ڈینوب کو عبور کیا۔ نیش کے مقام پر عثمانی فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ اور انہیں شکست دی۔ اب ہونیاڈے اور آگے بڑھا۔ اس نے صوفیہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہ اور آگے بڑھا اور کوہ بلقان کو عبور کر کے فلپوپولس پر حملہ آور ہوا۔ کوہ بلقان کے دامن میں پھر عثمانی لشکر سے آمنا سامنا ہوا۔

لیکن عثمانی لشکر اس مرتبہ بھی ہارا۔ اور ہونیاڈے فتح اور کامرانی کے جوش میں جھومتا ہوا آگے بڑھا۔

اب سلطان مراد ایشیائے کوچک سے واپس پہنچ چکا تھا لیکن ترکی حکومت کی طاقت اس درجہ منتشر اور پراگندہ ہو چکی تھی کہ اس نے مناسب یہی سمجھا کہ جنگ کے بجائے صلح کر لی جائے۔

۱۲ جولائی ۱۴۴۴ء کو بمقام زے۔ جے۔ ڈن ایک خیمہ میں سلطان مراد اور شہنشاہ لاڈسلاس سے ملاقات ہوئی۔

سلطان مراد:۔ میں اپنے دوست شہنشاہ لاڈسلاس سے امید رکھتا ہوں کہ انہوں نے اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے صلح نامہ کے بارے میں مشورہ کر لیا ہوگا۔ میں بہرحال جب تک جنگ پر مجبور نہ کر دیا جاؤں جنگ پر صلح کو ترجیح دیتا ہوں۔

لاڈسلاس:۔ ہاں میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لیا۔ اگر آپ سرویا

کو آزاد کر دیں اور اُس کی خود مختاری تسلیم کر لیں۔ ولاچیا۔ ہنگری کو واپس کر دیں تو ہم صلح کے لئے تیار ہیں۔

سُلطان مراد:۔ میں یہ شرائط منظور کرتا ہوں۔

لاڈسلاس:۔ یہ صلح نامہ دس سال کے لئے ہوگا۔

سلطان مراد:۔ مجھے یہ بھی منظور ہے۔

لاڈسلاس:۔ میں اِس معاہدہ پر پابند رہنے کی قسم کھاتا ہوں۔

سلطان مراد:۔ میں عہد کرتا ہوں کہ پوری دیانت اور صداقت کے ساتھ اس معاہدہ پر عمل کروں گا۔

لاڈسلاس:۔ آئیے اب ہم دوستوں کی طرح مصافحہ کریں۔

(نغمۂ صلح)

سلطان مراد نے پوری دیانت داری کے ساتھ معاہدہ کی دفعات پر عمل کیا۔ اور اپنے بیٹے محمد کو جس کی عمر صرف چودہ برس کی تھی تختِ حکومت پر بٹھا کر گوشہ نشین ہو گیا۔ اس کا دل اب دُنیا سے بیزار ہو گیا تھا۔ اُسے اپنے لائق شہزادے علاؤ الدین کی جواں مرگی نے دنیا سے متنفر کر دیا تھا وہ اب صرف یادِ الٰہی میں اپنی باقی زندگی گذار دینا چاہتا ہوں۔

صلح نامہ زے جے ڈن کی سیاہی بھی نہیں خشک ہوئی تھی کہ سلطان

مراد ایک ہی مہینہ کے اندر تخت حکومت سے دست بردار ہوگیا۔ اور اس خبر کے سنتے ہی لاڈسلاس ہونیاڈے اور پوپ کے نمائندے نے فیصلہ کرلیا کہ معاہدہ کو توڑ دیا جائے اور یورپ کو ترکوں سے خالی کرالیا جائے۔

ہنگری کی مجلس قومی میں یہ مسئلہ پیش ہوا۔ لاڈسلاس نے کہا۔

لاڈسلاس:۔ واقعی یہ بہترین موقع ہے ترکوں کو ختم کردینے کا۔ کیوں ہونیاڈے تم کیا کہتے ہو؟

ہونیاڈے: سلطنت عثمانیہ کی باگ ایک نوعمر لڑکے کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہماری بہترین اور منظم فوجوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

یہی نہیں ایشیائے کوچک میں بھی مراد کی دست برداری کی خبر سنتے ہی بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے ہیں۔

عثمانی فوجیں اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے بڑی تعداد میں روانہ ہوچکی ہیں۔

درہ دانیال پر وینس، جنیوا اور برگنڈی کے بحری بیڑوں کا قبضہ ہے۔ جن کے باعث ایشیائے کوچک سے ترکی فوجیں یورپ کی سرزمین پر قدم نہیں دھر سکتیں۔ بس اب شہنشاہ لاڈسلاس کو اپنا لشکر گراں لے کر ترکوں پر چل پڑنا چاہیئے۔

لاڈسلاس:۔ میں تو پہلے ہی یہ فیصلہ کرچکا ہوں۔

ایک ممبر :۔ مجلس قومی کے ایک ممبر کی حیثیت سے میں اس فیصلہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کیا شہنشاہ جواب مرحمت فرمائیں گے ؟

لاڈسلاس :۔ ضرور۔ ضرور۔ پوچھو۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو ؟

ممبر :۔ ہم ترکوں سے دس سال تک نہ لڑنے کا عہد کر چکے ہیں۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے شہنشاہ نے اس معاہدے کی پابندی کرنے کا عہد کیا تھا۔

لاڈسلاس :۔ ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے عہد کیا تھا۔ لیکن مجھے کارڈنیل جولین نے یقین دلایا ہے کہ معاہدہ توڑنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں کارڈنیل جولین سے دریافت کرتا ہوں کہ وہ قومی پارلیمنٹ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں

جولین :۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ ترکوں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی لازمی نہیں۔

ممبر :۔ کارڈنیل جولین کے اس فتوے کے بعد کوئی اعتراض نہیں۔ ہم ترکوں کو ختم کرنے کے لئے ہر قربانی پر آمادہ ہیں۔

جولین :۔ میں اُن لوگوں سے جو معاہدہ توڑنے کے بارے میں متردد ہیں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اس موقع پر تم ان اُمیدوں کو توڑ دو گے جو تو م نے

تم سے قائم کرائی ہیں۔ کیا تم اس خوش بختی سے فائدہ نہ اُٹھاؤ گے جو مراد کی دست برداری کی صورت میں تمہیں حاصل ہوئی ہے ۔ میں تمہاری فوج کو برکت دیتا ہوں۔ شہرت اور نجات کے راستے پر میرے پیچھے پیچھے چلو ۔ اور اگر اب بھی تمہیں کچھ پس وپیش ہے تو میں اس گناہ کا وبال اپنے سر لیتا ہوں ۔ کیا اب بھی اس قومی مجلس کے کسی ممبر میں ہچکچاہٹ باقی ہے ۔ ؟

ایک ممبر:۔ نہیں ۔

دوسرا ممبر:۔ بالکل نہیں ۔

تیسرا ممبر:۔ ہرگز نہیں ۔

چوتھا ممبر:۔ ہم ہر قربانی کے لئے تیار ہیں ۔

پانچواں ممبر:۔ ہم ترکوں کا وجود ختم کر دیں گے ۔

جولین :۔ اب میں ہونیاڈے کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں ۔

ہونیاڈے :۔ میں سر ہتھیلی پر لے کر نکلا ہوں ۔ نہ جنگ سے ڈرتا ہوں نہ عہد شکنی سے ۔ لیکن میں کارڈنیل جولین اور اپنے آقا شہنشاہ لاڈسلاس سے پوچھنا چاہتا ہوں اس کارگذاری کا معاوضہ مجھے کیا ملے گا ؟

جولین :۔ کیا جنت کی خوش خبری تمہارے لئے کافی نہیں ؟

ہونیاڈے :۔ نہیں ـــــ میں اپنے خدمات کا معاوضہ اس دُنیا میں بھی چاہتا ہوں۔

لاڈسلاس :۔ تمہیں ہر وہ معاوضہ ملے گا جو تم چاہو۔ جو تم مانگو۔ بتاؤ تمہاری کیا خواہش ہے ؟

ہونیاڈے :۔ بلغاریہ کا تاج۔

لاڈسلاس :۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اگر بلغاریہ ترکوں سے چھین لیا گیا تو وہاں کا تاج میں خود اپنے ہاتھ سے تمہارے سر پر رکھوں گا۔

ہونیاڈے :۔ اِن الفاظ سے میں پورے طور پر مطمئن ہوں۔ اور جنگ کے میدان میں ہر وقت کود نے کو تیار ہوں۔ لیکن معاہدہ شکنی کا اعلان پہلی ستمبر تک ملتوی کر دیا جائے۔

جولین :۔ یہ کیوں ؟

ہونیاڈے :۔ تاکہ ترک اُن تمام قلعوں اور علاقوں کو خالی کر دیں جنہیں خالی کرنے کا کام اُنہوں نے معاہدہ کے مطابق شروع کر دیا ہے۔

جولین :۔ (قہقہہ لگا کر) مجھے تمہاری رائے سے اتفاق ہے۔ یہ بہت بڑی اور بہت اچھی جنگی چال تمہاری سمجھ میں آئی ہے۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

مشہور مورخ لین پول اس واقعہ کا اپنی تاریخ میں ذکر کرتا ہوا کہتا ہے جس طریقہ سے یہ غداری عمل میں لائی گئی اُس سے زیادہ معیوب بات یورپ کے سُورماؤں اور ایک بڑے سپہ لار کی بدنامی کے لئے تصوّر میں بھی نہیں آسکتیں عثمانی دستے معاہدہ کے مطابق قلعوں اور علاقوں سے نکل گئے۔ اتحادیوں نے صلحنامہ سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ شاہ لاڈسلاس، کارڈنیل جولین اور ہونیادے یکم ستمبر کو ایک لشکرِ گراں کے ساتھ ترکوں پر حملہ کرنے کے لئے بڑھے۔ ترک اِس فریب سے بالکل بے خبر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا متعدد قلعے اُن کے ہاتھ سے نکل گئے۔ قلعوں کے ترکی دستے یا قتل کر دیئے گئے یا چٹانوں سے گرا کر ہلاک کر دیئے گئے۔ بحرِ اسود کے ساحل پر پہنچ کر حملہ آوروں نے جنوب کا رُخ کیا اور کئی اہم مقامات کو فتح کرتے ہوئے وارنہ پہنچے اور اس مشہور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ترک اس اچانک حملہ کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔

اِن حالات کی اطلاع مراد کو اُس کے گوشۂ عافیت میں ملی اور اس سے استدعا کی گئی کہ وہ پھر تاج حکومت سر پر رکھے۔ اور میدان جنگ میں پہنچ جائے۔ مراد نے یہ استدعا قبول کر لی۔ وہ چالیس ہزار جنگ آزمودہ سپاہیوں کو لے کر وارنہ کی طرف بڑھا۔ اگرچہ دردانیال کی ہر طرف سے ناکہ بندی ہو چکی تھی۔ لیکن وہ اپنی فوجیں یورپ میں اُتار لایا۔ وارنہ سے چار میل کے فاصلہ پر اس نے اپنے خیمے نصب کرائے اور جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔ یہ خبر دشمن کے

کیمپ میں بھی پہنچی۔ جولین نے کہا۔

جولین:- ہونیاڈے! سلطان مراد اپنی فوجیں لے کر مقابلہ کے لئے آن موجود ہوا!!

ہونیاڈے:- آپ کیوں فکرمند ہوتے ہیں۔ مراد آ گیا تو کیا ہوا۔ آنے دیجئے۔ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو فریدیہ پاشا کا ہوا تھا۔

لاڈسلاس:- ہماری مجلس جنگ کے بعض ممبروں کی یہ رائے ہے کہ لشکرگاہ کے گرد ناکہ بندی کر کے مراد کے حملہ کا انتظار کرنا چاہیئے۔

ہونیاڈے:- شہنشاہ اس رائے سے مجھے اختلاف ہے۔ میں اپنا پورا لشکر لے کر آگے بڑھوں گا۔ اور پوری طاقت سے دشمن کا سر کچل دوں گا۔

۱۰ر نومبر ۱۴۴۴ء کو دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں۔ پوری فوج کے داہنے بائیں ہنگری اور ولاچیا کے بہترین دستے تھے۔ ہنگری کے دستوں کے ساتھ کارڈنیل جولین کی سرکردگی میں شہسواروں کی ایک خاص جماعت بھی تھی۔

لاڈسلاس شاہی دستے کو لے کر قلب لشکر کو قوت پہنچا رہا تھا۔

ہونیاڈے پوری فوج کا سپہ سالار تھا۔

ترکوں کے لشکر میں دو صفیں سواروں ۔ اور پیدل فوجوں کی تھیں۔ ان صفوں کے نیچے خود سلطان مراد کے زیر کمان شاہی دستے تھے۔ ایک اُونچے نیزے کے سرے پر صلح نامہ لٹکے، جے، ڈن کی نقل فوجی نشان کی طرح ہوا میں لہرا رہی تھی۔ اور بقول مورخ کریسی کے اُس منتقم حقیقی کو پکار رہی تھی جو لوگوں کو عہد شکنی کی سزا دیتا ہے۔

شروع شروع میں یورپ والوں کا حملہ بہت کامیاب رہا۔ ترکوں کی پہلی صف کے قدم اُکھڑ گئے۔ اور فوج میں انتشار پیدا ہوا کہ شکست کا اندیشہ پیدا ہونے لگا۔ دفعتہً مراد نے گھوڑا آگے بڑھا کر فوجوں کا حوصلہ بڑھانا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے جنگ کا نقشہ بدل گیا۔

(جنگ کی گہما گہمی)

سلطان مراد:۔ شاباش بہادرو! خبردار قدم پیچھے نہ ہٹے۔ موت صرف ایک بار آتی ہے، اور ضرور آتی ہے۔ صرف ایک مرتبہ مرنا ہے اور بزدل ہزاروں مرتبہ ــــ خدا کی نصرت تمہارے ساتھ ہے تم جنگ پر مجبور کئے گئے ہو۔ اب دشمن کو ایسا سبق دو کہ وہ ہمیشہ کے لئے جنگ سے توبہ کر لے۔

(گھمسان کا سماں، بندوقوں کے فیر، تلواروں کی شپاشپ طبل، قرنا، بون کی آوازیں ــــــــ بھگدڑ)

آخر یورپ والوں کا یہ متحدہ لشکر بھاگ نکلا۔

دو تہائی سابقہ میدان جنگ پر کام آئے، ایک تہائی نے راہِ فرار اختیار کی۔ پولینڈ و ہنگری کے بادشاہ لاڈسلاس کو ایک ینی چری، خواجہ خیری نے قتل کر کے اُس کا سر اپنے نیزے پر اُٹھا لیا۔

کارڈینل جولین بھی کلیسائے رومہ کے کئی بشپ سورماؤں کے ساتھ ہلاک ہوا۔

ہونیاڈے بُری طرح زخمی ہو کر بھاگ نکلا۔ اور اُس کا کوئی نشان نہ ملا ــــ اور سلطان مراد بامراد و دل شاد اپنی ظفر مند فوجوں کے ساتھ ان عہد شکن دشمنوں کی قوت پارہ پارہ کر کے اپنے پایۂ تخت کو واپس آ گیا۔

نہ صرف اتحادیوں کے اس لشکر کو شکست ہوئی بلکہ ترکوں کے وہ مقبوضات جو صلح نامہ کی رُو سے آزاد کر دیئے گئے تھے سلطنت عثمانیہ کے ماتحت اور باج گذار ہو گئے۔

اس جنگ نے سرویا اور بوسینا کو پھر ترکی مملکت کا ایک حصہ بنا دیا۔

سرویا کا مشہور مورخ رانکی (Ranke) بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ ہونیاڈے اور سلطان مراد سے الگ الگ پوچھا گیا۔ سرویا پر مکمل قبضہ کے بعد مذہب کے بارے میں کیا پالیسی رکھی جائے گی؟

ہونیاڈے نے جواب دیا:۔

"میں سرویا کو رومن کیتھولک مذہب قبول کرنے پر مجبور کروں گا۔"

اور سلطان مراد نے جواب دیا :-

"میں ہر مسجد کے پاس ایک گرجا بنواؤں گا۔ اور لوگوں کو پوری آزادی دوں گا کہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق خواہ مسجد میں جا کر عبادت کریں، خواہ گرجا میں۔"

قدرت نے ہونیاڈے کو ظالمانہ پالیسی پر عمل کرنے کا موقع نہ دیا۔ اور سلطان مراد نے جو کہا تھا کر کے دکھا دیا۔

اُس کا یہ انصاف دیکھ کر وہاں کے باشندے بیساختہ پکار اُٹھے۔

"سُلطان مُراد زندہ باد!"

مگر وہ حکمرانی جس کا سکّہ جان و دل پر تھا

کردار

مہدی ..... خلیفہ بغداد

درباری .....

ابوعبیداللہ ..... وزیراعظم

کنیز .....

خیزراں ..... مہدی کی بیوی

مزنہ ..... آخری اموی بادشاہ کی بیوی

زینب ..... ملکہ کی خواص

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ایک عالم پہ
مگر وہ حکمرانی جس کا سکّہ جان و دل پر تھا

اموی حکومت کا چراغ گُل ہو چکا ہے۔ عبّاسی خاندان کا پرچم اقبال حجاز مقدّس، شام، عراق، مصر اور دوسرے ممالک پر لہرا رہا ہے۔ عباسی خاندان کا پہلا خلیفہ سفاح تھا۔ اس کے بعد مسند خلافت پر منصور متمکن ہوا اور اب تخت خلافت پر اس کا بیٹا مہدی رونق افروز تھا۔ مہدی کے عفو و ـــــ رحم و کرم اور احسان و مروّت کی داستانیں تاریخ پر ثبت ہیں۔

آج مہدی کا جشن تخت نشینی ہے۔

(مہدی تخت نشین خلافت ہوتا ہے)

مہدی:۔ ہماری تخت نشینی کا خیر مقدم لوگوں نے کس طرح کیا؟

ایک درباری:۔ فخر و مسرّت کے ساتھ۔

دوسرا درباری:۔ لوگ جانتے ہیں تخت خلافت پر امیر المومنین مہدی متمکن ہوئے ہیں۔

تیسرا درباری:۔ جن کے رحم و کرم کی داستانیں زبان زد خاص و عام ہیں۔

چوتھا درباری:۔ جن کی سخاوت اور دریا دلی کا چار دانگ عالم میں شہرہ ہے

پہلا درباری:۔ جن کے تہوّر اور شجاعت، دلیری اور ہمّت، استقلال اور جرأت کا ایک دُنیا لوہا مانتی ہے۔

تیسرا درباری:۔ جن کی شوکت اور ہیبت سے زمین کانپتی اور آسمان لرزتا ہے۔

مہدی:۔ (باوقار کے لہجہ سے) ہم چاہتے ہیں آج کسی کے دل میں غم کا کانٹا نہ کھٹکے، روتے ہوئے چہرے مسکرانے لگیں افسردہ اور مضمحل، رنجور و ملول، دل شکستہ اور مایوس لوگ، ہر غم، ہر پریشانی اور ہر فکر سے آزاد ہو جائیں۔

چوتھا درباری: شہر کے چپّے چپّے اور گوشے گوشے کا یہی عالم ہے امیر المومنین جوان اور بوڑھے، مرد اور عورت، غریب اور امیر سب وفور مسرّت سے بے تاب ہو رہے ہیں۔

پہلا درباری:۔ جو مایوس تھے وہ مسرور ہیں۔

تیسرا آدمی :۔ جو مغموم تھے وہ جوشِ طرب سے دیوانے ہو رہے ہیں۔

مہدی :۔ ہم اپنے وزیرِ اعظم ابوعبید اللہ سے دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے سچ ہے؟

ابوعبید اللہ :۔ ایک ایک حرف سچ ہے امیر المومنین! میں نے خود سارے شہر کا گشت لگایا ہے اور اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لوگوں کی مسرّت اور شادمانی کا کیا عالم ہے؟ آج ہر شخص امیر المومنین کی تخت نشینی پر اپنی بے پایاں مسرت کا اظہار کر رہا ہے۔ میری آنکھوں نے نشاط شادمانی کے جو مناظر دیکھے ہیں، الفاظ ان کا اظہار کرنے سے قاصر ہیں۔

مہدی :۔ ابوعبید اللہ!

ابوعبید اللہ :۔ امیر المومنین

مہدی :۔ کیا نشاط و مسرت کی یہی کیفیت ان لوگوں پر بھی طاری ہے جو ایک عرصہ سے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں محبوس ہیں۔؟ انھیں نہیں معلوم اس چرخ نیلگوں پر کب ستارے چمکتے ہیں؟ کب چاند نکلتا ہے؟ جو نہیں جانتے خوشی کیسے منائی جاتی ہے، اور بے فکری کیا ہوتی ہے۔ جو ایک عرصہ دراز سے ہجر و فراق کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا تمہاری بتائی ہوئی نشاط و مسرت کی کیفیت ان پر طاری ہے)

(جواب نہیں ملتا)

مہدی :۔ ابو عبید اللہ !

ابو عبید اللہ :۔ امیر المومنین ۔

مہدی :۔ میرے سوال کا جواب دو ۔

ابو عبید اللہ :۔ امیر المومنین ! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قانون توڑا ۔

مہدی :۔ ہاں اور ——— ؟

ابو عبید اللہ :۔ انہوں نے اطاعت سے منہ موڑا ۔ اور بغاوت ، سازش اور بے وفائی کو اپنا شعار بنایا ۔

مہدی :۔ تم کہے جاؤ ۔ میں سن رہا ہوں ۔

ابو عبیدہ :۔ انہوں نے حکومت کے مشکلات میں اضافہ کیا ۔

مہدی :۔ لہذا یہ اس قابل ہیں کہ خوشی سے محروم رکھے جائیں ؟

ابو عبیدہ :۔ امیر المومنین !

مہدی :۔ ہم انہیں ایک مرتبہ پھر موقعہ دینا چاہتے ہیں ۔ ہم چاہتے ہیں ایک مرتبہ کھلی فضا میں یہ خود اپنے گذشتہ افعال کا محاسبہ کریں ۔ جائزہ لیں اور سوچیں ۔

ابو عبید اللہ :۔ امیر المومنین اس طرح !

مہدی :۔ ہم کچھ سننا نہیں چاہتے ۔ جیل خانہ کا آہنی پھاٹک کھول دو ۔ اور ہماری طرف سے عفو عام کا اعلان کر دو ۔

ابوعبیداللہ :۔ امیرالمومنین کا فرمان ابھی پورا کیا جائے گا۔

مہدی :۔ جن لوگوں کی جاگیریں ضبط کی گئی ہیں وہ بحال کردی جائیں۔

ابوعبیداللہ :۔ امیرالمومنین۔

مہدی :۔ جن پر جرمانے کئے گئے تھے وہ واپس کر دیئے جائیں۔

ابوعبیداللہ :۔ امیرالمومنین!

مہدی :۔ جنہیں قتل کی سزا دی گئی تھی اُنہیں معاف کر دیا جائے ——

۔ جنہیں قید کیا گیا تھا انہیں فی الفور رہا کر دیا جائے ——

تاکہ وہ جان لیں کہ مہدی کا رحم اُسکے غصّہ سے بہت بڑھا ہوا ہے

ابوعبیداللہ :۔ یہی ہوگا امیرالمومنین۔

(حرم سرا۔ مہدی کی بیوی خیزراں اپنی چند کنیزوں اور پیش خدمتوں کے جلو میں بیٹھی ہے)

ایک کنیز :۔ ملکۂ عالم آپ نے کچھ سُنا؟

خیزراں :۔ کیا کوئی نئی خبر؟

کنیز :۔ آج امیرالمومنین ——

خیزراں :۔ ہاں میں جانتی ہوں آج امیرالمومنین کی تخت نشینی کا دن ہے۔ اور میں نے حکم دے دیا ہے کہ آج حرم سرا میں بھی چراغاں کیا جائے۔

خوشی منائی جائے۔

کنیز :۔ لیکن میں کچھ اور کہہ رہی تھی ملکۂ عالم !

خیزراں :۔ کہو — تم کیا کہہ رہی تھیں ؟

کنیز :۔ آج امیرالمومنین نے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔

خیزراں :۔ بہت اچھا کیا۔ ہماری طرح بیچارے قیدیوں کی بھی خوشی منانے کا حق ہے۔

کنیز :۔ (جوش کے ساتھ) اُنہوں نے باغیوں کو بھی معاف کر دیا۔

خیزراں :۔ اور اچھا کیا۔ یہ امیرالمومنین کی کمزوری کا نہیں قوت کا نشان ہے۔

کنیز :۔ وہ کیسے ملکۂ عالم ؟

خیزراں :۔ انتقام خوف کا دوسرا نام ہے۔ اور رحم بیوقوفی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ہم انتقام اُس سے لیتے ہیں۔ سزا اُسے دیتے ہیں قید اس کو کرتے ہیں جس سے ہمیں کچھ اندیشہ ہو۔ جس سے ہم ڈرتے ہوں۔ جو ہمیں فکرمند رکھتا ہو۔ لیکن اگر ہم کسی پر رحم کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ہیں۔ نہ ہم اس سے مرعوب ہیں نہ خوف زدہ ؟

(قدموں کی آہٹ)

کنیز :۔ ملکۂ عالم ! ملکۂ عالم !!

خیزراں :۔ کیا بات ہے ؟

کنیز :۔ ایک عورت آپ سے ملنے کی تمنا لے کر آئی ہے ۔

خیزراں :۔ کون ہے وہ ؟

کنیز :۔ میں نہیں جانتی ملکۂ عالم ۔

دوسری کنیز :۔ اس خوشی کے موقعہ پر رنگ میں بھنگ ملانے کون آگیا ؟

کنیز :۔ ہاں کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے ۔ چہرہ اُترا ہوا ۔ لباس میلا اور پھٹا ہوا ۔ کچھ عجیب قسم کی مسکینیت چھائی ہوئی ہے اُس پر ۔ جاؤں ٹال دوں ۔ اِس وقت ؟

خیزراں :۔ نہیں ۔

کنیز :۔ تو بُلا لاؤں ملکۂ عالم ؟

خیزراں :۔ ہاں بُلا لاؤ ۔

خیزراں :۔ تم کون ہو ؟

عورت :۔ میرا نام مزنہ ہے ۔

خیزراں :۔ مزنہ ـــــ اِس نام کی کسی عورت سے ہم واقف نہیں ۔ تم کیوں آئی ہو ؟ کیا چاہتی ہو ؟ تمہارا مقصد کیا ہے ؟

مزنہ :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ایک زمانہ تھا کہ میں بھی دوسروں سے اِسی لب و

لہجہ میں اور اسی شان و شکوہ کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی۔ میرے حضور میں بھی لونڈیوں اور باندیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ جو چاہتی تھی وہ ہوتا تھا۔ جو کہتی تھی وہ ہو کر رہتا تھا۔

خیزراں :۔ اور اب ؟

مزنہ :۔ یہ پھٹے پرانے کپڑے جو آپ میرے جسم پر دیکھ رہے ہیں، یہ بھی میرے نہیں۔ ایک رحمدل بہن سے مانگ کر پہنے ہیں۔ دو دن ہو گئے۔ کھیل کا ایک دانہ بھی اُڑ کر مُنہ تک نہیں پہنچا ہے۔ دن کہیں گذارتی ہوں۔ رات کو کہیں پڑ رہتی ہوں۔ کبھی اِس در پر، کبھی اُس آستاں پر، کبھی یہاں کبھی وہاں۔ مل جاتا ہے، دو لقمے کھا کر ایک گھونٹ پانی کا پی لیتی ہوں نہیں ملتا تو فاقہ کر لیتی ہوں۔ پہلے طرح طرح کے کھانے کھا کر اچھے سے اچھے کپڑے پہن کر، ہیرے اور جواہرات، سونے اور چاندی کی دُنیا میں رہ کر شاید ہی کبھی خدا کا شکر ادا کرنے کی توفیق ملی ہو۔ اب ہر فاقہ پر، ہر تکلیف پر، ہر مصیبت پر بے ساختہ شکر کا لفظ زبان پر آجاتا ہے پہلے میں خدا سے بے نیاز تھی، اب وہ مجھ سے بے نیاز ہے۔

خیزراں :۔ ایسی باتیں نہ کرو بہن (ایک ٹھنڈا سانس لیکر) بندہ کبھی خدا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ خدا کبھی اپنے بندوں کو فراموش نہیں کرتا۔ اس کی بندہ نوازی عام ہے۔ کافر، مشرک، ملحد۔ مومن، سب ہی اس کی رحمت

کی گھٹائیں برستی ہیں ——————— وہ رب المومنین نہیں
رب العالمین ہے۔ اُس کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔ لیکن یہ
یہ تو دوسری باتیں چھڑ گئیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ تم کون ہو؟
کس خاندان سے تعلق رکھتی ہو؟

مزنہ:۔ میں جو کچھ ہوں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ رہا خاندان، سو وہ مٹ چکا۔ اس کے ذکر سے کیا حاصل۔

خیزراں:۔ تمہارے اس پژمردہ چہرے پر حُسن وجمال کی میناکاری اب بھی موجود ہے۔ اِن پھٹے پُرانے کپڑوں میں تم ایک شاہزادی معلوم ہوتی ہو۔ تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عیش وراحت کی گھڑیاں تم پر بھی گذر چکی ہیں۔ یہ دُنیا ہے۔ اِس دنیا میں انقلابات آتے ہی رہتے ہیں۔ جو پست ہوتے ہیں وہ بلندی پر پہنچ جاتے ہیں۔ جو بلندی پر پرواز کرتے ہیں اُنہیں پستی میں گرنا پڑتا ہے۔ ازل سے یہی ہوتا آیا ہے۔ اور ابد تک یہی ہوتا رہے گا۔ مجھے بتاؤ تم کون ہو؟ میں دل سے تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ ایسی مدد جو تمہارے شایانِ شان ہو۔

مزنہ:۔ اِسی اُمید پر ڈرتے ڈرتے حرم سرا کی دہلیز پر میں نے قدم رکھا تھا خدا کا شکر ہے میری اُمید پوری ہوئی۔

خیزراں:۔ لیکن میں تمہارا خاندان معلوم کر کے رہوں گی۔ تم یقیناً کوئی عالی

خاتون ہو۔ مجھے بتاؤ۔

مزنہ :۔ کیا بتاؤں ملکۂ عالم ؟

خیزراں :۔ مجھے یہ بتاؤ تم پر کیا اُفتاد پڑی تاکہ تمہاری راحت و آسائش کا خاطر خواہ بندوبست کروں۔ پھر یہ بتاؤ تم کس خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ تاکہ تمہارے وقار اور شان میں فرق نہ آنے پائے، بلکہ کچھ اور اضافہ ہو جائے۔

مزنہ :۔ ملکۂ عالم کی اتنی مہربانی کافی ہے کہ اُنہوں نے پرسش فرمائی۔ اور نگاہِ کرم سے دیکھ لیا۔

خیزراں :۔ پھر بھی تمہیں میرے سوال کا جواب دینا پڑے گا۔

مزنہ :۔ آپ مجھے بھی جانتی ہیں، میرے خاندان کو بھی، اور میری گذشتہ زندگی کو بھی۔

خیزراں :۔ (حیران ہو کر) یہ تم کیا کہہ رہی ہو ؟

مزنہ :۔ میں جھوٹ نہیں کہتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ غم نے میری صورت بگاڑ دی۔ اور اب وہ پہچانی نہیں جاتی۔ زمانے نے میرے خاندان کو تباہ کر دیا۔ اور اب وہ صرف قصّۂ ماضی بن کر رہ گیا ہے۔ میری گذشتہ زندگی کا ورق بھی ایسا اُلٹا کہ اب اُس کے دُہرانے سے سوا کُلفت کے کچھ حاصل نہیں۔

خیزراں :۔ تمہاری باتوں میں بڑا درد، بڑا سوز ہے۔ کچھ تو بتاؤ، میری بہن تم سب کچھ کہہ جاتی ہو، لیکن کھُل کر نہیں کہتیں۔ آخر بات کیا ہے کچھ تو کہو۔

مزنہ :۔ میرا نام مزنہ ہے۔

خیزراں :۔ وہ تو میں سُن چکی اور ——

مزنہ :۔ میں خاندان بنو اُمیہ کے آخری فرماں روا، مروان بن محمد کی بیوی ہوں۔

خیزراں :۔ تم وہ مزنہ ہو ؟

مزنہ :۔ ہاں

خیزراں :۔ آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کی بیوی ؟

مزنہ :۔ ہاں وہی بدنصیب !

(رونے لگتی ہے سسکیوں کی آواز)

خیزراں :۔ تم نے بہت اچھا کیا جو یہاں چلی آئیں، اب زندگی بھر تم آرام و آسائش سے رہو گی —— زینب ——!

زینب :۔ ملکۂ عالم

خیزراں :۔ تم نے مزنہ کو پہچانا ؟

زینب :۔ خوب اچھی طرح ملکۂ عالم۔

خیزراں :۔ ان کی اچھی طرح مہمانداری کرو۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دو انہیں اچھے سے اچھا کھانا کھلاؤ۔ حمام میں لے جاؤ۔ اور اعلیٰ درجہ کے کپڑے زیب تن کراؤ۔ دیکھو خبردار! یہ یہاں اجنبیت اور غیرت محسوس نہ کرنے پائیں۔

زینب :۔ ملکۂ عالم کا ارشاد میں نے سن لیا۔

خیزراں :۔ تو جاؤ تعمیل کرو۔

زینب :۔ ابھی لیجئے۔ لیکن اگر اجازت ہو تو میں بھی دو دو باتیں ان سے کرلوں؟

خیزراں :۔ تم مزنہ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہو؟

زینب :۔ جی انہی سے۔

خیزراں :۔ شوق سے۔ میں نے تمہیں منع تو نہیں کیا ہے؟

زینب :۔ کیوں بی بی مزنہ! ہے اجازت؟ کچھ پوچھوں؟

مزنہ :۔ پوچھو۔

زینب :۔ کچھ پرانی باتیں بھی یاد ہیں؟

مزنہ :۔ کیوں نہیں۔ بہت سی۔

زینب :۔ (شوخ لہجے میں) میرا مطلب ہے خاص قسم کی۔

مزنہ :۔ کچھ اتا پتا بتاؤ تو بتا سکونگی۔

زینب :۔ (طنزیہ لہجہ میں) یہ تو میں نہیں جانتی کہ بتا سکو گی یا نہیں ؟ یہ ضرور جانتی ہوں کہ وہ ایسی بات نہیں جو تمہیں یاد نہ ہو۔

خیزراں :۔ آخر تو پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہے۔ پوچھتی کیوں نہیں ؟

زینب :۔ ملکۂ عالم ! ذرا مزنہ بہن کے حافظے کو جھنجھوڑ لوں تو پوچھوں۔

خیزراں :۔ بس بہت ہو لیا۔ تجھے جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ !

زینب :۔ میں یہ پوچھ رہی تھی بہن مزنہ تم سے، کہ ہمارے خاندان بنو عباس کے بانی مبانی خلیفہ سفاح کا نام تو تم نے ضرور سُنا ہوگا ؟

مزنہ :۔ ہاں۔ اُنہیں کون نہیں جانتا۔ سُنا ہے۔ لیکن مطلب ؟

زینب :۔ جی وہی عرض کرتی ہوں ـــ تو خلیفہ سفاح کے بڑے بھائی ابراہیم کا نام بھی ضرور سُنا ہوگا تم نے ؟

مزنہ :۔ ہاں سُنا ہے۔

زینب :۔ کچھ معلوم ہے اُن کے بارے میں ؟ سچ سچ کہنا بہن۔

مزنہ :۔ ہاں ـــ وہ قتل کر دیئے گئے تھے۔

زینب :۔ (طنزیہ) ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔ تو حضور کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان بیچارے کو قتل کس کے حکم سے کیا گیا تھا ؟

(مزنہ خاموش ہے)

زینب :۔ یہ لیجئے۔ آپ تو چُپ ہو گئیں۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔

(مزنہ نے کوئی جواب نہیں دیا)

زینب :۔ بولئے۔ بتائیے۔ یوں خاموشی سے کام نہیں چلے گا۔

(مزنہ خاموش ہے)

زینب :۔ آپ نہیں بتائیں گی شاید شرم آتی ہے آپ کو؟ ہے نا یہی بات ـــــ اچھا مجھ سے سُنئے۔ میں بتاتی ہوں ـــــ وہ تھے آپ کے شوہر، خاندان بنی اُمیّہ کے آخری چشم وچراغ۔ مروان محمد ـــــ یاد آیا؟

(مزنہ خاموش ہے)

زینب :۔ بہن مزنہ! تمہاری خاموشی تو ٹوٹتی ہی نہیں۔ اچھا لو۔ ایک بات اور سُنو، وہ مروان کی نہیں خود تمہاری ہے۔ سُنوگی؟

خیزراں :۔ اور بھی کوئی بات ہے؟

زینب :۔ جی ـــــ اور پہلی سے بھی زیادہ اہم!

خیزراں :۔ وہ کیا ہے؟

زینب :۔ لونڈی ابھی عرض کرتی ہے۔ ان کا مزنہ بہن کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ ہاں تو مزنہ بہن سُنتی ہو؟

مزنہ :۔ سُن رہی ہوں۔

زینب :۔ شکر ہے بولیں تو ـــــ ہاں تو ذرا غور سے سُننا ـــــ

مزنہ :- بہت غور سے سُن رہی ہوں ۔

زینب :- وہ دن یاد کرو جب ابراہیم کی لاش لے کر ہم تمہارے درِ دولت تک روتے پیٹتے، منّت سماجت کرتے، عرض و التجا کرتے ہوئے پہنچے تھے ۔ اور ——————

خیزراں :- اور —— اور کیا —— ؟

زینب :- اور —— ہماری یہ مزنہ بہن غصّہ میں آگئیں ۔

خیزراں :- غصّہ میں آگئیں ؟

زینب :- ہاں ملکۂ عالم ۔ یہ مزنہ غصّے میں آگئی ۔ اُس نے ہمیں ڈانٹا نہایت سختی اور حقارت کے ساتھ کہا، مردوں کے معاملات میں عورتوں کو کیا دخل ۔ اور جب پھر بھی ہماری منّت سماجت جاری رہی ۔ تو اس نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ ہمیں مروان کے قصر سے نکال باہر کر دیں ۔ ہمارے رونے پر اس کا کلیجہ نہ پسیجا ۔ ہمارے آنسوؤں پر اُسے ترس نہ آیا ۔ ہماری بے کسی اور بے بسی پر اُس کے رحم نے اس کی اِنسانیت نے جنبش نہ کی ۔ ہماری فریاد سے اس کے پتھر کے سے سخت دل پر اثر نہ ہوا ۔ یہ ہنس رہی تھی ۔ ہم رو رہے تھے یہ عیش کر رہی تھی ہم ٹھوکریں کھا رہے تھے ۔ یہ حکومت کر رہی تھی ہم قتل ہو رہے تھے —— اور آج جب وہی ٹھوکریں اسے ملیں

دُچادر اوڑھ کر ہماری دہلیز پر پہنچ گئیں ـــــ گویا ہم بے وقوف ہیں گویا ہمارا حافظہ معطل ہو چکا ہے۔ ہم وہ سب کچھ بھول گئے جو ہمارے ساتھ کسی اور نے نہیں، مروان کی اس بیوی مزنہ نے کیا تھا۔

مزنہ! (بلند آواز سے) کان کھول کر سُن لے۔ ہماری ملکہ خیزراں واقعی بڑی رحم دل اور رقیق القلب ہیں۔ لیکن ہماری موجودگی میں تو انکے رحم و کرم سے ناجائز فائدہ نہیں اُٹھا سکتی۔ ہرگز نہیں اُٹھا سکتی۔

مزنہ:۔ زینب تم نے جو کچھ کہا، بالکل سچ کہا۔ نہ اس میں جھوٹ ہے نہ مبالغہ۔ لیکن ایک بات تم بھول گئیں۔

زینب:۔ تم یاد دلادو

ایسا انقلاب، جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس انقلاب نے ہماری رفعت کو پستی سے بدل دیا۔ ہمارے خاندان کو پریشان کر دیا۔ ہماری حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ ہمارے اشراف اور معززین کو ذلیل کر دیا۔ قتل کر دیا۔ تم آج نہیں کل جانو گی۔ اور میں آج جانتی ہوں کہ اس انقلاب کی ایک اور صرف ایک وجہ تھی ـــــ اور وہ وجہ اس کے سوا کوئی اور نہ تھی کہ ہم سے وہ حرکتیں سرزد ہونے لگی تھیں

جن کا تم نے ابھی ذکر کیا۔ اگر تم اپنی مالکہ، ملکۂ خیزراں کی سچّی دوست اور ہمدرد ہوتیں تو تمہاری کوشش یہ ہونی چاہیئے تھی کہ وہ اِن حرکتوں سے دُور رہیں جو ہم سے سرزد ہو چکی ہیں۔ اور جنہوں نے ہمیں یہ دِن دکھایا۔ لیکن یا تم ان کی دوست نہیں ہو، اور یا اگر دوست ہو تو نادان دوست، کہ اُنہیں اپنے غصّہ اور جوشِ انتقام کے باعث اُسی تباہ کن راستے پر لے چلنا چاہتی ہو جس نے ہمیں تباہ و برباد کیا۔ مجھے کوئی حق نہیں کہ تمہیں نصیحت کروں۔ تم نے جو کچھ کہا ٹھیک کہا۔ جو کچھ کر رہی ہو وہ بھی ٹھیک ہی ہے ـــــ اچھا بہن خیزراں رخصت ـــــ میں نادم ہو کر جاتی ہوں، روتی ہوئی آئی تھی، روتی ہی ہوئی واپس جا رہی ہوں۔

(قدموں کی آواز)

خیزراں :۔ مزنہ!

(واپس آنے کی آہٹ)

خیزراں :۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ تم اب یہیں رہو گی۔ تم واپس نہیں جا سکتیں۔ زینب کی باتوں کا خیال نہ کرو۔ وہ بیوقوف ہے ـــــــ

زینب ـــــــ!

زینب :۔ کنیز حاضر ہے۔

خیزراں :۔ تمہیں میرا حکم بجالانا پڑے گا۔

زینب :۔ بسروچشم ملکۂ عالم۔

خیزراں :۔ تمہیں مزنہ سے معافی مانگنی پڑے گی۔ اس کی دل دہی کرنی پڑے گی۔ اس کی راحت و آسائش کا پورا پورا خیال رکھنا پڑے گا۔ سُن لیا تم نے؟

زینب :۔ سُن لیا ملکۂ عالم۔

خیزراں :۔ جاؤ مزنہ کو لے جاؤ، حمام کراؤ۔ کپڑے بدلواؤ۔ پھر دسترخوان بچھواؤ۔ ہم اور وہ ساتھ کھانا کھائیں گے۔

زینب :۔ بہن مزنہ آؤ۔ میرے ساتھ چلو۔

(چلنے کی آواز)

خیزراں :۔ کپڑے بدل لئے مزنہ؟

مزنہ :۔ بدل لئے ملکۂ عالم۔

خیزراں :۔ مجھے ملکۂ عالم نہ کہو۔ بہن کہو، یہ کافی ہے۔

مزنہ :۔ آپ میں وہی شان اور وہی آن بان ہے جو ایک عرب خاتون میں ہونی چاہیئے۔

خیزراں :۔ تم نے زینب کو معاف کر دیا ہے؟

مزنہ :۔ میں کیا اور میری معافی کیا۔

خیزراں :۔ نہیں۔ مجھے بتاؤ اُس نے تم سے معافی مانگی یا نہیں ؟

مزنہ :۔ مانگ لی۔ میں نے معاف کر دیا۔ آپ ذرّے کو آفتاب بنانا خوب جانتی ہیں۔

خیزراں :۔ نہیں۔ یہ نہ کہو۔

مزنہ :۔ پھر کیا کہوں ؟

خیزراں :۔ یہ کہو کہ میں آفتاب کو ذرّہ نہیں بننے دیتی۔

کنیز :۔ خاصہ تیار ہے ملکۂ عالم۔

خیزراں :۔ چلو مزنہ۔ بھوک تو تمہیں بھی لگ رہی ہوگی ؟

مزنہ :۔ چلئے۔

خیزراں :۔ آج رات کو امیرالمومنین سے شام کے کھانے کے بعد گفتگو کروں گی۔ اور کوشش کروں گی تمہاری راحت و آسائش کا کوئی مُستقل انتظام ہو جائے۔

مزنہ :۔ میرے لئے آپ کی سرپرستی کافی ہے۔ امیرالمومنین سے میرا ذکر کر کے اُن کا وقت نہ ضائع کیجئے۔

خیزراں :۔ مجھے اُمید ہے امیرالمومنین تمہارا بہت خیال کریں گے۔ وہ بڑے رقیق القلب اور رحم دل آدمی ہیں۔ وہ دشمنوں پر بھی رحم کرتے

ہیں۔ تو تم اُن کی ایک طرح سے بنتِ عم ہو۔ صرف میری صورت
دیکھ رہی ہو۔ کھاتی کیوں نہیں؟ —— یہ لو —— اسے چکھو۔

خیزراں :۔ امیرالمومنین! مزنہ کی آج کی باتوں نے میرا دل ہلا دیا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جب اُس نے دُنیا کی بے ثباتی اور انقلاب کی نیرنگی پر زبان کھولی۔ میں نے زینب کو بہت ڈانٹا۔

مہدی :۔ بہت اچھا کیا۔

خیزراں :۔ میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ مزنہ سے معافی مانگے۔

مہدی :۔ تمہیں یہی کرنا چاہیئے تھا۔

خیزراں :۔ میں نے مزنہ کو محل میں رکھ لیا ہے۔

مہدی :۔ درست۔ مناسب۔

خیزراں :۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ امیرالمومنین سے کہہ کر اُس کی راحت و آسائش کا مستقل بندوبست کرا دوں گی۔

مہدی :۔ تمہارا وعدہ ضرور پورا ہوگا۔ خیزراں کا وعدہ مہدی پر قرض ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ اور مہدی اُسے پُورا کرے گا۔

خیزراں :۔ (خوش ہو کر) امیرالمومنین آپ میرا کتنا خیال کرتے ہیں۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں۔

مہدی :۔ ہمیں بھی اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے کہ تم جیسی عالی ظرف اور بلند فطرت خاتون ہماری رفیقہ حیات ہے۔

خیزراں :۔ میں ڈر رہی تھی کہیں امیرالمومنین برہم نہ ہو جائیں اِس اقدام پر۔

مہدی :۔ یہ اندیشہ تمہارے دل میں کیوں پیدا ہوا؟

خیزراں :۔ زینب نے ابراہیم کے قتل اور اُن کی لاش کا ذکر ایسے بھیانک طریقے سے کیا کہ سچ پوچھئے تو خود میرا خون بھی کھولنے لگا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے میرا جی چاہا کہ میں بھی مزنہ کو ذلیل کر کے محل سے نکلوا دوں۔ لیکن پھر یہی خیال آیا کہ ہم اُس کی اُمّت میں ہیں جس نے اپنے چچا حضرت حمزہ کے قاتل حبشی کو معاف کر دیا تھا۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ کو معاف کر دیا تھا۔ جس نے حضرت حمزہ کا جگر دانتوں سے چبایا تھا۔ جس نے کبھی انتقام نہیں لیا۔ ہمیشہ عفو و درگزر سے کام لیا۔ یہ سوچ کر میرا دل مضبوط ہو گیا۔ اور مجھے یقین ہو گیا۔ امیرالمومنین ہرگز مجھ پر برہم نہیں ہوں گے۔

مہدی :۔ (محبّت بھرے لہجہ میں) پھر تم نے مجھے کیسا پایا؟

خیزراں :۔ جس کی مجھے توقع تھی ——— امیرالمومنین میں چاہتی ہوں مزنہ کو ایک بار آپ کی خدمت میں پیش کروں

مہدی :- کیوں ؟

خیزراں :- تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کی پچھلی باتیں فراموش کر دی گئیں۔ اور وہ بغیر کسی جھجک کے آزادی اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرے گی۔

مہدی :- تمہیں اختیار ہے۔

مہدی :- مزنہ ـــــ تم ہماری بنت عم ہو؟ اس محل میں آج سے تمہاری وہی حیثیت ہوگی جو خاندان عباسیہ کی دوسری شہزادیوں کی۔ تمہیں بھی اتنی ہی جاگیر، ذاتی مصارف کے لئے دی جائیگی جو انہیں دی گئی ہے۔ تم میں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ تم ان کی بہن ہو۔ وہ تمہاری بہنیں ہیں۔

خیزراں :- سنتی ہو مزنہ۔ امیر المومنین کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔

مزنہ :- خدا امیر المومنین کو عمر خضر عطا فرمائے۔

خیزراں :- (شوخی کے ساتھ) اور مجھے ؟

مزنہ :- آپ کو بھی ـــــ بہن خیزراں تمہارا اور امیر المومنین کا شکر چاہوں تو بھی نہیں ادا کر سکتی - جو کچھ کر سکتی ہوں وہ صرف یہ کہ

رحمت کند خدائے کہ کرد است یاوری　　یا آں کسے کہ یاور و ناصر نہ داشتند

شہادتِ حسینؑ

اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جو اپنی ایک مستند اور مکمل تاریخ رکھتا ہے

اس کی تاریخ روایات و قصص کا مجموعہ نہیں، واقعات و حقائق کا دفتر ہے۔

تاریخ اسلام کے واقعات پر دنیا نے تنقیدی نگاہ ڈالی۔ اُنہیں جانچا، پرکھا، کسوٹی پر کسا۔ اور پھر اُن پر مُہر تصدیق ثبت کر دی۔

یہ ایسے واقعات ہیں جن کی صداقت آفتاب کی طرح روشن اور تابناک ہے۔ جن کی سچائی پر اس دُنیا کا ذرّہ ذرّہ گواہ ہے۔

نور و ظلمت، حق و باطل، صدق و دروغ کا چولی دامن کا ساتھ ہے اگر اندھیرا نہ ہو تو اُجالے کی قدر کیونکر معلوم ہو سکتی ہے۔ اگر باطل کا وجود نہ ہو تو حق کی سربلندی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اگر جھوٹ کا فریب

نمودار نہ ہو تو صدق کی روشنی نہیں پھیل سکتی۔

حق و باطل کی آویزش ہمیشہ سے جاری ہے۔ اور شاید قیامت تک جاری رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بو لہبی

حق و باطل کی اِس آویزش نے ہمیشہ ایثار و قربانی، جاں نثاری و فداکاری، استقلال اور استقامت کے ایسے مناظر پیش کئے ہیں جنہیں دیکھ کر چشمِ فلک بھی تھرّا اُٹھی

ایک طرف باطل کی دَل بادل فوجیں، سیم و زر کا انبار، ساز و سامان جنگ کی فراوانی، قوت و شوکت کا مظاہرہ، توپ و تفنگ کی نمائش۔ اور دوسری طرف، بھوک اور پیاس، فقر و فلاکت، بے مائگی اور بے سروسامانی۔

باطل کو اپنی قوت پر غرور،
حق کو اپنی صداقت پر ناز،

مقابلہ ہوا
گردنیں کٹیں
خون کے دریا بہے۔

جسم و جان کا رشتہ منقطع ہوا۔

نیزوں اور خنجروں، تلواروں اور نیزوں کی چمک نے آنکھیں خیرہ کر دیں۔

قوت اور شوکت کے دیو بے نے فضا بدل دی۔

ایسا معلوم ہونے لگا جیسے حق ناکام ہوا، اور باطل غالب آ گیا۔

لیکن ایسا ہوا کبھی نہیں۔ حق ہمیشہ جیتا۔ اور باطل ہمیشہ ناکام رہا۔

اگرچہ حق کی رگِ گلو کٹ گئی ہو۔ اور باطل کے حصہ میں تختِ کبریائی آ گیا ہو۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

دین کی حرمت اور حق کا بول بالا کرنے کے لئے جان دیدینا، گردن کٹا دینا۔ اسلامیوں کا پرانا شعار ہے۔

یہ وہ سنّت دیرینہ ہے جس پر عمل کرنے میں کبھی اسلام کے پرستار اور دینِ محمد کے فدا کار نہیں جھجکے۔

کربلا کے تپتے ہوئے ریگ زار میں آج سے تیرہ سو برس پہلے فدویت اور جاں نثاری کا جو مظاہرہ ہوا تھا، وہ اسی سُنّت دیرینہ

اور شعار قدیم کی تجدید تھی۔

سرِّ ابراہیم و اسمٰعیل بود
یعنی آں اجمال را تفصیل بود

یہ ہے وہ میراثِ مسلمانی جو اسلاف سے اخلاف تک پہنچتی چلی آتی ہے۔

یہ ہے وہ جذبہ، جس نے باطل کی یورش، فسق کی یلغار اور کفر کے استیلا کے باوجود اسلام کو ہمیشہ سربلند رکھا۔ اس کا عَلَم کبھی سرنگوں نہ ہو سکا۔

اِسلام کی فِطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اُتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

داعیِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اس دنیا سے پردہ فرما چکے تھے خلافت راشدہ کا دورِ سعید ختم ہو چکا تھا۔
ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ کے روایات فراموش ہو چکے تھے۔
اسلام کی شورائیت، جمہوریت اور عوامیت دم توڑ رہی تھی۔
اسلام کی تاریخ میں پہلی بار ملوکیت اور شاہیت کا فروغ شروع ہوا تھا۔
تقویٰ، خداترسی اور الٰہیت، کا چراغ گُل ہو رہا تھا۔

خودغرضی، خودپسندی اور ملوکانہ جاہ وتجمّل کا ظہور ہو رہا تھا۔
سبطِ رسولؐ اور جگر گوشۂ بتول سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔
اُسے معلوم تھا باطل کے پاس عوام سے لوٹی ہوئی دولت کا انبار ہے۔
ضمیر فروشوں اور ایمان کا سودا کرنے والوں کی فوج در فوج ہے۔
لیکن یہ معلوم ہونے کے باوجود وہ میدانِ جہاد میں اُترا۔
اُس کے پاس جو توشہ تھا وہ توکّل تھا۔ جو پونجی تھی وہ قناعت تھی۔
اس کی جھولی میں سونے اور چاندی کے سکّے نہ تھے۔ لیکن اس کے
دل میں اسلام کی حرمت پر مر مٹنے کا جذبہ مچل رہا تھا۔ اُس کے دماغ
میں اسلام کے ناموس پر فدا ہو جانے کی تمنّا بیتاب ہو رہی تھی۔ اس
کے سینہ میں اسلام کے وقار کی خاطر پہاڑ سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا
ہو چکا تھا۔
پھر کیا پرواہ تھی اگر ساتھی انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ اگر دولت
ناپید تھی، اگر سامانِ جنگ مفقود تھا۔
یہ ساز و سامان تو اُن لوگوں کو مطلوب ہوتا ہے جو زندہ رہنا چاہتے
ہوں۔
لیکن جو جان دے دینے کا تہیہ کر چکے ہوں وہ سر کٹا دینے کے بعد
بھی اگر کچھ کہتے ہیں تو صرف اِتنا ؎

جان دی ـــــ دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق اَدا نہ ہوا

عام حالات میں لوگ زندگی سے محروم ہوتے ہیں تو مر جاتے ہیں۔
اور مر کر پھر کبھی زندہ نہیں ہوتے۔
لیکن جو لوگ خدا کے راستے میں جان دیتے ہیں وہ کبھی نہیں مرتے
زندہ جاوید بن جاتے ہیں۔
اور ان کے زندہ جاوید ہونے کی شہادت خود خالق کائنات دیتا ہے۔
لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّ
لٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ
یعنی جو لوگ خدا کے راستے میں قتل کیے جائیں اُنہیں مُردہ مت کہو
وہ زندہ ہیں۔ لیکن تم اُن کی زندگی محسوس نہیں کر پاتے۔

کربلا کے میدان میں امام حسین اور اُن کی قیادت میں اہل بیت اطہار
نے جس تہور و شجاعت کا نمونہ پیش فرمایا اُسے دُنیا کبھی نہیں بھول
سکے گی ؎

کیا غازیانِ فوجِ خدا نام کر گئے
لاکھوں سے تشنہ کام لڑے، کام کر گئے

اُمّت کی مغفرت کا سر انجام کر گئے
فیض اپنا مثلِ ابرِ کرم عام کر گئے
پڑھتے ہیں سب درود جو ذکر ان کے ہوتے ہیں

ایسے بشر وہ تھے کہ ملک جن کو روتے ہیں
دیندار و سرفروش، شجاع و خود اعتقاد
ہاتھوں میں تیغیں، اور دلوں میں خدا کی یاد
زخموں کو نخلِ قد یہ وہ سمجھے گلِ مراد
مردانگی یہ پیاس میں، فاقوں میں یہ جہاد

تیغوں سے بند کون سا اُن کا کٹا نہ تھا
پر معرکے سے پاؤں کسی کا ہٹا نہ تھا
جن کی شجاعت اور دلاوری کا یہ عالم تھا
رستم اُٹھا نہ سکتا تھا سر اُن کے سامنے
شیروں کے کانپتے تھے جگر اُن کے سامنے
پھیکی تھی روشنی تمر اُن کے سامنے
اُڑتا تھا رنگ روئے سحر اُن کے سامنے

پُر خوں قبائیں جسم میں، سینے تنے ہوئے
پہنچے ریاضِ خُلد میں دُولھا بنے ہوئے

جن کے کردار اور سیرت کی یہ کیفیت تھی ؎

لاکھوں میں انتخاب، ہزاروں میں لاجواب
تھا خشک و تر پہ جن کا کرم صورتِ سحاب
وہ نور، وہ جلال، وہ رونق، وہ آب و تاب
زہرا کے گھر کے چاند، زمانے کے آفتاب

لشکر جو اُن پہ ٹوٹ پڑے شام و روم کے
تلواریں کھائیں جسم پہ، کیا جھوم جھوم کے

یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔

چشمِ فلک نے ایسا لرزہ خیز منظر کبھی نہ دیکھا تھا
ایک طرف اشقیا کا بڑی دل لشکر تھا۔
دوسری طرف ان کوفیوں کی غداری اور عہد شکنی تھی جنہوں نے نامہ ہائے اطاعت بھیج بھیج کر امام عالی مقام کو دعوتِ جہاد دی تھی۔
یہ کوفی ایک ایک کر کے امام عالی مقام کا ساتھ چھوڑتے گئے۔
نہ اُنہیں اپنے وعدے یاد تھے نہ آلِ رسول کا لحاظ، نہ ناموس کا پاس۔
یہ وقت کی بڑی طاقت کے سامنے سر بسجود ہو گئے۔ اُنہوں نے

دین بیچ کر دُنیا کا سودا کر لیا۔ اُنہوں نے یہ گوارا کر لیا کہ خاندان رسول کے جوان اور بچے تنومند اور بیمار موت کے گھاٹ اُتار دیے جائیں۔ یہ اُس پر بھی آمادہ ہو گئے کہ ناموس امام کی بے حُرمتی ہو۔ لیکن اُنہیں یہ منظور نہ تھا کہ سر کٹا کر زندگی جاوید کے مالک بن جائیں۔ دُنیا دے کر دین لے لیں۔

امام عالی مقام کا قافلہ جاں باز و ۷۲ نفوس پر مشتمل تھا۔ اس میں مرد اور بچے، تندرست اور بیمار سب شامل تھے۔ اشقیا کے لشکر نے یہ سمجھا تھا کہ کوفیوں کی غداری امام عالی مقام کے عزم و استقامت میں کمزوری پیدا کر دے گی۔ وہ اطاعت قبول کر لیں گے۔ اسلام کی سربلندی کا خیال ترک کر کے محض اپنی اور اپنے خاندان کی جان بچانے کے لئے وہ ایک فاسق کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔

لیکن ایسا نہ ہوا، بے یار و مددگار ہونے کے باوجود امام عالی مقام نے یزید کی بیعت کرنے سے اِنکار کر دیا۔

یہ انکار باطل کے سینے پر گھونسہ بن کر لگا۔ وہ مارِ دم بریدہ کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا۔

اُس نے ننگِ انسانیت حرکتوں کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

خیام امام کا محاصرہ کر لیا گیا۔
ناکہ بندی میں اتنی شدّت اختیار کی گئی کہ اناج کا ایک دانہ
نہ پہنچ سکا۔
فرات کا دریائے شیریں سامنے لہریں لے رہا تھا۔
ایک خلقت تھی کہ اس دریا سے سیراب ہو رہی تھی۔
لیکن قافلہ حسین کے تشنہ کام ایک قطرۂ آب سے بھی
محروم تھے۔
تیر و کمان سے مسلّح شاہی سپاہی کھڑے تھے کہ جو دریا کی طرف
رُخ کرے اُس کا سینہ چھلنی کر دیں
جو ادھر بڑھے خود اسی کے خون گلو سے اس کی تشنہ لبی دُور کریں۔
خیمہ امام میں بچّے بھوک سے بلک رہے تھے۔ جوانوں کی تشنہ لبی
نے انہیں نڈھال کر رکھا تھا۔
لشکر اشقیا کی طرف سے بار بار غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ
ہو رہا تھا۔
کہا جا رہا تھا۔ پانی کا ایک قطرہ بھی اس وقت تک نہیں مل سکتا،
جب تک یزید کے ہاتھ پر بیعت نہ کر لی جائے۔
لیکن یہ مسلسل بھوک، یہ مسلسل پیاس، یہ نہ ٹوٹنے والا فاقہ، یہ نہ

سیراب ہونے والی تشنگی ، یہ بے بسی کا عالم ، ان میں سے کوئی چیز بھی مردانِ حق کے قدموں میں جنبش نہ پیدا کر سکی ۔

حق بجائے خود بہت بڑی قوت ہے ۔ وہ نہ فقر فاقہ سے ہراساں ہوتا ہے نہ موت کی سختیاں اسے جادۂ صواب سے منحرف کرتی ہیں

وہ ٹوٹ جاتا ہے مگر لچکتا نہیں ۔

وہ موت کو قبول کر لیتا ہے ۔ زندگی کو ٹھکرا دیتا ہے لیکن اپنی آن میں فرق نہیں آنے دیتا ۔

وہ سودا نہیں کرتا ۔

وہ مفاہمت نہیں کرتا ۔ اس لئے نہیں کرتا کہ کبھی اور کسی قیمت پر وہ باطل سے مصالحت کر کے اپنے دامن کو داغ دار نہیں کر سکتا ۔

یہ سارے واقعات کربلا کے میدان میں پیش آئے ۔ اور پوری شدّت کے ساتھ رُونما ہوئے ۔

امام حسین نے سب کچھ گوارا کر لیا مگر وہ اسے گوارا نہ کر سکے کہ باطل کی آقائی تسلیم کریں ۔

اجمیر کے ولی کامل ، خواجہ معین الدین چشتی نے حق کی اسی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے ۔

شاہ ہست حسینؑ ، بادشاہ ہست حسینؑ
دین است حسینؑ ، دین پناہ ہست حسینؑ
سرداد و نہ داد دست در دستِ یزید
حقّا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

تین دن اس عالم میں گذر گئے کہ پانی کی ایک بوند بھی امام عالی مقام کے خیمے تک نہ پہنچ سکی۔

بچّوں کا تڑپنا اور بلکنا عبّاس نامور سے نہ دیکھا گیا۔

وہ مشک لے کر فرات پر گئے۔ مگر دشمنوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر کے انہیں شہید کر دیا۔

یہ جنگ کا بگل تھا۔

ایک لشکر گراں اور ایک قافلہ سخت جاں میں جنگ شروع ہو گئی۔

؎ غل تھا کہ خوں میں بھر گیا سقّائے اہلِ بیت
دُنیا سے کوچ کر گیا سقّائے اہلِ بیت
ہم لُٹ گئے ، گذر گیا سقّائے اہلِ بیت
فریاد ہے کہ مر گیا سقّائے اہلِ بیت
ہے ہے کہاں سے اپنے بہشتی کو لائیں گے

سُوکھی زبان اب کسے بچّے دِکھائیں گے

اشقیا کے لشکر میں عبّاسؓ نامور کی شہادت نے نشاط و مسرت کا عالم پیدا کر دیا۔

وہ جانتے تھے قافلۂ امام کے ہر فرد کا وہی حشر ہوگا جو عباس نامور کا ہوا۔

عمرو بن سعد نے خود امام والامرتبت کو پکارا ؎

باقی کوئی نہیں تو وغا کو خود آیئے
حیدر کی ذوالفقار کے جوہر دِکھایئے
زخمِ سنان و خنجر و شمشیر کھایئے
گرمی بڑی ہے آج لہو میں نہایئے

آمادہ ہم تو دیر سے بہرِ ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں اُپی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

یہ لاف زنی کی باتیں سُنکر خاندان مصطفوی اور دودمان مرتضوی کے گلِ سرسبد علی اکبر سے ضبط نہ ہو سکا۔ ۱۸ سال کی عمر لیکن فنونِ جنگ میں ماہر، شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں اپنی نظیر آپ۔

علی اکبر اپنے پدر نامور، امام حسین علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا ؎

ہم کو یہ طعن و طنز کی باتیں نہیں پسند
کوفے میں لینگے دم جو اٹھائینگے پھر سمند
ہونٹوں پہ غم سے اب ہے یہاں جان دردمند
کاٹیں تبر سے تیغ سے خنجر سے بند بند

ہنس ہنس کے جسم پر تبر و تیر کھائیں گے
تیغ زباں کے زخم اُٹھائے نہ جائیں گے

علی اکبر کے اِن الفاظ نے امام عالی مقام کے ستم رسیدہ دل کو دونیم کر دیا۔

ابھی ابھی برادر اصغر، جری و دلاور عباس نامدار نے تیروں کے ہجوم میں جامِ شہادت نوش کیا تھا۔

اور اب خاندان کا وہ نونہال میدانِ جہاد میں جانے کے لئے مچل رہا تھا جس کی ذات سے خاندان کی سربلندی اور سرافرازی کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔

جو باپ کا عصائے پیری تھا۔

جسے دیکھ کر ماں کا مُرجھایا ہوا دل کنول کی طرح کِھل جاتا تھا۔

جسے حضرت زینبؓ نے پالا پوسا اور پروان چڑھایا تھا۔

جس کا وجود بہنوں اور بھائیوں کے لئے ایک بہت بڑی نعمت تھا۔

جو ہم شکل پیمبر تھا۔

جس کا عنفوانِ شباب پاکی اور پاکیزگی کا نمونہ تھا۔

اسی نوجوان علی اکبر کو رن پر بھیجنے کا سوال درپیش تھا۔

امام عالی مقام کو معلوم تھا۔ علی اکبر کو رن پر بھیجنے سے ماں کے ٹوٹے ہوئے دل پر کیسی قیامت گذرے گی۔ پھوپی یعنی حضرت زینب جب یہ سُنیں گی تو وفورِ غم اور شدّتِ الم سے اُن کے قلبِ ناتواں کا کیا عالم ہوگا؟

اس درخواست کے جواب میں اُنہوں نے فرمایا۔

خدا کے راستے میں سر کٹانا، زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ ہماری نماز، ہماری قربانی، ہماری زندگی، ہماری موت، سب کچھ خدا اور صرف خدا کے لیے ہے۔ جو سارے جہان کا پالنے والا ہے۔

اِنَّ صَلاتِی وَنُسُکِی وَمَحیایَ وَمَماتِی لِلّٰہِ رَبِّ العالمین

علی اکبر نے فرمایا، تو پھر اذنِ جہاد مرحمت ہو۔

امام عالی مقام نے فرمایا۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے لیکن جہاد کے شرائط میں والدین کی اجازت اوّلین شرط ہے۔ میں اپنی طرف سے اجازت دے چکا ہوں۔ لیکن رن کی طرف بڑھنے سے پہلے

ضروری ہے کہ اپنی ماں شہر بانو سے اجازت لے لو۔ اور ہاں اپنی پھوپی زینب سے بھی پوچھ لو کہ ان کا حق ماں سے کچھ زیادہ ہی ہے انہوں نے اپنے لڑکوں کو اتنا نہیں چاہا۔ جتنا تمہیں چاہا۔ اپنی اولاد کی پرواہ نہ کی۔ مگر تمہارے آرام و آسائش کے لئے رات رات بھر جاگیں۔ ہر طرح کی تکلیفیں اُٹھائیں۔

باپ کے یہ الفاظ سُن کر علی اکبر اپنی ماں کے پاس پہنچے اور کہا

دیتے نہیں رضا جو امام فلک اساس
خاطر فقط یہ آپ کی ہے اور پھوپی کا پاس
اب غیر کوئی پاس نہیں اُن کے آس پاس
ناطاقتی ہے، ضعف ہے، فاقہ ہے اور پیاس
کیونکر لڑینگے وہ کہ سراپا ضعیف ہیں
پیری میں دل ضعیف ہے، اعضا ضعیف ہیں

امام عالی مقام کی یہ کیفیت بیان کر کے علی اکبر نے دل ہلا دینے والے الفاظ میں کہا ؎

عباس جب سے مر گئے روتے ہیں دم بدم
رُخ زرد ہے، کماں کی طرح ہو گئے ہیں خم
چلّوں میں تیر جوڑے ہیں واں بانیٔ ستم

قرباں ہوں کس طرح پسرِ فاطمہ پہ ہم
سب رو رہے ہیں رن کی طرف جائیں کس طرح
ماں کو، پھوپی کو، بہنوں کو سمجھائیں کس طرح

یہ الفاظ سُن کر حضرت شہر بانو کی مہرِ مادری پر فریضۂ مذہبی غالب آگیا۔ اُنہوں نے فرمایا

زہرا کے لال پر مرے مادر پدر نثار
عابد نثار۔ اصغرِ تشنہ جگر نثار
جانیں ہزار ہوں تو فدا، لاکھ سر نثار
قربان گھر، کنیز تصدّق۔ پسر نثار

کسرائی گو کہ ہوں پہ بہو میں علی کی ہوں
مانگو گے جو وہ دونگی کہ لونڈی سخی کی ہوں

اپنی طرف سے اجازت دینے کے بعد حضرت شہر بانو نے علی اکبر کو حضرت زینب کے حقوق کی طرف متوجہ کیا ؎

کہنے کو یوں ہیں چاہنے والے تمہارے سب
لیکن ہے اُن کے عشق سے نسبت کسی کو کب
دن کو اُنہوں نے دن کبھی جانا نہ شب کو شب
لیجئے ابھی سے آپ کو جس شے کی ہے طلب

مجھ سے نہ کچھ نہ سیّدِ عالی سے پوچھئے
گر پوچھئے تو پالنے والی سے پوچھئے

حضرت زینب کو راضی کرنے کا مرحلہ بڑا کٹھن اور بڑا سخت تھا۔ حضرت زینب نے اپنے دونوں فرزندوں عون اور محمد کو بڑی خوشی اور پورے استقلال و استقامت سے رن میں جانے اور وقارِ اسلام پر قربان ہو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ گئے اور مرتبۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔

وہ اپنے فرزندوں سے بھی زیادہ علی اکبر کو چاہتی تھیں۔ اور اب ان کی باری تھی۔

علی اکبر آئے اور اُنہوں نے کہا۔ ؎

پیدا ہوا تو آپ کی صحبت ملی مجھے
کرتی ہے شکر روح وہ راحت ملی مجھے
یوسف کو کب ملی تھی جو دولت ملی مجھے
رکھا عزیز آپ نے عزّت ملی مجھے
صدقہ ہے اس قدم کا جو سر تا فلک گیا
کی مہر آفتاب نے ذرّہ چمک گیا

مرضی نہ ہو تو رن کو بھی جائے نہ یہ غلام

بندے ہیں ہم اطاعت مالک سے ہم کو کام
تکرار کی مجال، نہ اصرار کا مقام
مرتے اگر تو اس میں بھی آقا آپ ہی کا نام
روتی ہیں آپ کس لئے اچھا نہ جائیں گے
پر یاد رکھئے منہ نہ کسی کو دکھائیں گے

حضرت زینب نے جس جذبۂ ایمانی سے کام لے کر عون و محمد کو اذنِ جہاد مرحمت فرمایا تھا وہی پھر سامنے آیا۔ اور آپ نے علی اکبر کو بھی رن میں جانے کی اجازت عطا فرمادی۔

اجازت ملتے ہی ؎

گھوڑے پہ شاہزادۂ عالم ہوا سوار
گویا چلے جہاد کو محبوبِ کردگار
تھا ثانیِ براق فلک سیر راہوار
صرصر سے تند و تیز تو بجلی سے بیقرار
یوں سامنے سے وہ دمِ جولاں نکل گیا
گویا ہوا پہ تختِ سلیماں نکل گیا

جس نے دیکھا وہ پکار اٹھا ؎

اللہ رے نبیرۂ مشکل کشا کی شان

تھی جس کے عضو عضو سے پیدا خدا کی شان
حیران تھے لوگ دیکھ کے اُس مہ لقا کی شان
حمزہؑ کا رُعب، زورِ علیؑ، مصطفےٰؐ کی شان
پاکیزگی نسب میں بزرگی صفات میں
شیرینیِ کلام حسن بات بات میں

جس کے کردار اور سیرت کا یہ عالم تھا ؎

دل پاک، رُوح پاک، نظر پاک، جسم پاک
طینت میں آب خلد تھا، اور کربلا کی خاک
غرفوں سے جس کے حُسن کی حوروں کی جھانک تانک
یوسف جو دیکھ لے جو کہے روحی فداک

نام اُس کا لوح پر جو قلم نے رقم کیا
سو بار پڑھ کے سورۂ اخلاص دم کیا

علی اکبر کو دیکھ کر دوست اور دشمن سب دنگ رہ گئے ؎

غل تھا رسولؐ پاک کے ثانی کو دیکھنا
حُسنِ بہار باغِ جوانی کو دیکھنا
کھلتے ہیں گُل شگفتہ بیانی کو دیکھنا
نازک لب اس صفت کے دہن اس طریق کا

خاتم پہ یا جرّا ہے نگینہ عقیق کا

علی اکبر کو دیکھ کر دشمنوں نے سمجھ لیا کہ اگر اس نوعمر شہسوار کو شہید کر دیا تو قافلۂ حسینؑ کو شکست دے دی۔

؎ ناگاہ فوجِ کیں سے عمرو نے کیا کلام
یہ وقتِ کارزار ہے اے ساکنانِ شام
بس ہے یہی بساط شہنشاہِ خاص و عام
مارا گیا یہ شیر تو مر جائیں گے امام
لوٹو جنابِ فاطمہؑ زہراؑ کے باغ کو
ٹھنڈا کرو حسین کے گھر کو چراغ کو

اور پھر اپنی فوج کو مقابل دیکھ کر اُس نے کہا ؎

یہ گُل عذار دختر حیدر کی جان ہے
بہنوں کی زندگی ہے برادر کی جان ہے
بابا کی رُوح ہے، تنِ مادر کی جان ہے
بے جاں کرو اسے کہ یہ سب گھر کی جان ہے
جوشن یہی ہے بازوئے یرنا و پیر کا
بعد اس کے خاتمہ ہے صغیر و کبیر کا

عمرو بن سعد کا یہ فرمان سُنتے ہی ؎

لڑنے کو اس طرف سے عدو سب کے سب بڑھے
تنہا اِدھر سے اکبر عالی نسب بڑھے
چومے قدم نہیب نے جھک کر یہ جب بڑھے
گویا پئے جہاد امیرِ عرب بڑھے

دہشت سے فوجِ شام کی بدلی سمٹ گئی
قدرت خدا کی دن جو بڑھا رات گھٹ گئی

اور جب علی اکبر نے تن تنہا فوج اشقیا سے جنگ شروع کر دی تو ؎

بڑھ کر کسی نے وار جو روکا سپر کٹی
چار آئینہ کٹا زرہِ خیرہ سر کٹی
نیزے کی ہر گرہ صفتِ نیشکر کٹی
سینہ کٹا، جگر ہوا زخمی کمر کٹی

رہوار بھی دو نیم میان مصاف تھا
ان سب کے بعد منہ کو جو دیکھا تو صاف تھا

بڑے معرکہ کا رن پڑا۔ علی اکبر کی تلوار بجلی کی طرح چمکتی تھی۔ دشمن کی صفوں پر گرتی تھی اور ان کا خرمنِ حیات خاکستر کر دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا ؎

سر خود سروں کے چنبر گردن سے اُڑ گئے
ہاتھ آستیں سے اُڑ گئے سر تن سے اُڑ گئے
ڈر ڈر کے سب پرند نشیمن سے اُڑ گئے
تھے قتلِ عام پر علی اکبر تُلے ہوئے
رستے تھے بند زخموں کے کوچے کھلے ہوئے

ابن سعد نے یہ منظر دیکھا تو چلّایا سے
فاقہ ہے تین روز کا سولہ پہر کی پیاس
دیکھے نبیرۂ اسد اللہ کے حواس
دریا سے تم قریب ہو اور اِس قدر ہراس
برساؤ تیر دُور سے جاؤ نہ اس کے پاس
بپھرے ہوئے اسد کہیں تلوار کھاتے ہیں
جب اُٹھ سکے نہ شیر تو نزدیک جاتے ہیں

یہ سُن کے تشنہ لب پہ چلے چار سُو سے تیر
پتھر عقب سے پڑنے لگے روبرو سے تیر
آتے تھے فوج فوج سپاہِ عدو سے تیر
سب سُرخ تھے شبیہہ نبی کے لہو سے تیر
مقتل سے کیا ہجوم تھا اس نورِ عین پر

پروانے گر رہے تھے چراغِ حسین پر

علی اکبر نے اَن گنت زخم کھائے۔ لیکن میدان سے مُنہ نہ موڑا۔

آخر کار ؎

یوں آگیا سنانوں میں وہ آسماں جناب
ہو جس طرح خطوط شعاعی میں آفتاب
سُوکھی زباں پہ پڑ گئے کانٹے بغیر آب
طاقت بھی فرطِ ضعف سے دینے لگی جواب
آمد ہوئی جو غش کی سرِ پاک جُھک گیا
واحسرتا کہ ہاتھ بھی لڑنے سے رُک گیا

اب دشمنوں کی بن آئی ؎

غُل تھا کرو نہ رحم تنِ پاش پاش پر
دوڑا دو گھوڑے اکبرِ مہرو کی لاش پر

امام عالی مقام کے سامنے اُن کے فداکار اور جاں نثار عزیز اور رشتہ دار بھائی اور بیٹے، بھانجے اور بھتیجے ایک ایک کر کے خدا کی راہ میں قربان ہوتے رہے۔
مگر اُن کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی۔

لشکر اشقیا کی طرف سے بار بار کہا جاتا تھا اگر سب یزید کی بیعت کرلیں تو دریائے فرات کا پانی آپ کے لئے کھول دیا جائے گا ۔
اعزاز واکرام کے ساتھ آپ کو مدینہ یا جہاں آپ کہیں واپس کردیا جائیگا
آپ کے اجلال واحترام میں کسی قسم کی کمی نہیں آنے پائے گی ۔
لیکن آپ نے ہر مرتبہ اس پیشکش کو مسترد فرمادیا ۔
اس لئے کہ حق اور باطل میں صلح نہیں ہوسکتی ۔
اسلام اور فسق کبھی بھی ایک جگہ مجتمع نہیں ہوسکتے ۔
مردمومن کسی قیمت پر بھی ایک ایسے شخص کی اطاعت اور ایک ایسے نظام کی پیروی نہیں کرسکتا جو اسلام کی روح تعلیم اور فلسفہ سے کوئی مناسبت نہ رکھتا ہو
حسین کے پیش نظر ذاتی سربلندی اور منفعت نہیں تھی ۔
اُس کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا ۔
یہ کہ اسلام کا بول بالا ہو ۔ حق کا کلمہ پڑھا جائے ۔
اور اُمت مسلمہ کے لئے خدا کے آخری رسول نے جو اسوۂ حسنہ اپنی عملی زندگی کی صورت میں پیش کردیا ہے ۔ اس کی متابعت کی جائے ۔
یزید کے دور میں اسلام کی بجائے خود اسی کا سکّہ چلتا تھا ۔
اسلام کی بنیادی تعلیمات کی علی الاعلان خلاف ورزی ہورہی تھی ۔

خدا کا خوف دلوں سے نکل چکا تھا۔ فسق و فجور کی گرم بازاری تھی۔
احکام اسلامی سے بالاتر ایک اور حکم تھا۔ اور وہ تھا یزید کا فرمان
جس کی تعمیل لازمی قرار دے دی گئی تھی۔
قرآن موجود تھا۔ سنّت نبوی کے آثار و نقوش موجود تھے۔ خلفائے
راشدین کی زندگی کا ایک ایک واقعہ محفوظ تھا۔
لیکن قرآن کے احکام وقف طاقِ نسیاں ہو گئے تھے۔
سنّتِ نبوی کے آثار و نقوش فراموش کر دیئے گئے تھے۔
خلافتِ راشدہ کا نظام متروک قرار دے دیا گیا تھا۔
حسین کی اِسلامیت اور للّٰہیت نے سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنی آل اولاد
کی قربانی دے کر اس استبداد اور غیر اسلامی ماحول کے خلاف
بغاوت کی۔
یہ جان کر میدانِ جہاد میں قدم رکھا کہ اس جد و جہد اور کشمکش کا
انجام کیا ہوگا۔
وہ جانتے تھے اور اُنہوں نے اپنے رفیقوں اور ساتھیوں سے
کہہ دیا تھا۔

من و تو گر فنا شدیم چہ باک
غرض اندر میاں سلامت اوست

اسلام کی سلامتی کے لئے تعلیمات اسلامی کے حفظ و بقا کے لئے
اسلامی روح کی تحفظ کے لئے اُنہیں ۔ اس کا کوئی غم نہ تھا کہ
وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔

اُنہیں صرف ایک بات کی فکر تھی۔ یہ کہ اسلام کو زوال نہ آنے پائے۔
اُنہوں نے بیعت کی دعوت بار بار مسترد کی۔ بے سروسامانی کے عالم
میں گھر کی عورتوں اور پیار لڑکے کو، خدا کے سپرد کیا اور یکہ و تنہا میدان
جہاد میں پہنچ گئے۔

مخالف ماحول، نامساعد حالات، ناسازگار فضا، ہجوم اعدا اور
نرغہ اشقیا کی۔ اُنہوں نے ذرا پرواہ نہ کی۔ تلوار اُن کے ہاتھ میں
تھی۔ اور سامنے ایک لشکر جرار۔ اُس مردِ خدا کی جان لینے پر تُلا
کھڑا تھا۔

اور موسم کا یہ عالم تھا کہ ؎

گرمی کا روزِ جنگ کی کیونکر کروں بیاں
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لو کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں
رن کی زمیں تو سُرخ تھی اور زرد آسماں
آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر

گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

لیکن ؎

اس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہِ اُمم
نے دامنِ رسول تھا، نے سایۂ عَلَم
شعلے جگر سے آہ کے اُٹھتے تھے دم بدم
اُودے تھے لب، زبان میں کانٹے، کمر میں خم
بے آب تیسرا تھا جو دن میہمان کو
ہوتی تھی بات بات میں، لکنت زبان کو

اِس تشنگی، گرسنگی اور ضعف و نقاہت کے باوجود حال یہ تھا کہ

؎ آئے حسینؑ یوں کہ عقاب آئے جس طرح
کافر پہ کبریا کا عتاب آئے جس طرح
تابندہ برق سوئے سحاب آئے جس طرح
دوڑا فرس نشیب میں آب آئے جس طرح
یوں تیغِ تیز کوند گئی اس گروہ پر
بجلی تڑپ کے گرتی ہے جس طرح کوہ پر

اللہ رے خوفِ تیغِ شہِ کائنات کا
زہرہ تھا آب، خوف کے مارے فرات کا

دریا پہ حال یہ تھا ہر اک بدصفات کا
چارا فرار کا تھا نہ یارا ثبات کا

غُل تھا کہ برق گرتی ہے ہر درع پوش پر
بھاگو، خدا کے قہر کا دریا ہے جوش پر
آیا خدا کا قہر جدھر سن سے آ گئی
کانوں میں الاماں کی صدا زن سے آ گئی
دد کر کے خود، زین پہ جوشن سے آ گئی
کھنچتی ہوئی زمین پہ توسن سے آ گئی

بجلی گری جو خاک پہ تیغِ جناب کی
آئی صدا زمین سے یا بُوتُراب کی

صف پر صفیں، پروں پہ پرے پیش و پس گرے
اسوار پر سوار، فرس پر فرس گرے
اُٹھ کر زمین سے پانچ جو بھاگے تو دس گرے
مخبر پہ پیک، پیک پہ مرکر عفس گرے

ٹوٹے پرے شکست بنائے ستم ہوئی
دُنیا میں اِس طرح کی بھی اُفتاد کم ہوئی

جنگ اپنی پوری شدّت اور ہولناکی کے ساتھ جاری تھی۔

دشمن کا لشکر اپنی پوری قوت صرف کر رہا تھا۔ لیکن اب تک وہ غالب نہ آسکا تھا۔

کیفیت یہ تھی کہ امام مظلوم کی برق شمشیر دشمنوں کے نخلِ حیات قطع کر رہی تھی۔ ایک طرف پورا لشکر، دوسری جانب ایک تشنہ لب اور گرسنہ سپاہی، پھر بھی وہ لشکر جان کی امان مانگ رہا تھا۔

پھر تو یہ غُل ہوا کہ دُہائی حسینؑ کی
اللہ کا غضب ہے لڑائی حسینؑ کی
دریا حسینؑ کا ہے ترائی حسینؑ کی
دُنیا حسینؑ کی ہے خدائی حسینؑ کی

بیڑا بچایا آپ نے طوفاں سے نوح کا
رب امم، واسطہ علی اکبر کی رُوح کا

دشمن نے سمجھ لیا تھا اگر آج فیصلہ نہ ہوا تو پھر کبھی نہ ہوسکے گا۔

سینے پہ سامنے سے چلے دس ہزار تیر
چھاتی پہ لگ گئے کئی سو ایک بار تیر
پہلو کے ہار برچھیاں، سینے کے پار تیر
پڑتے تھے دس تو کھینچتے تھے تن سے چار تیر

یوں تھے خدنگ ظلِّ الٰہی کے جسم پر
جس طرح خار ہوتے ہیں ساہی کے جسم پر

چلتے تھے چار سمت سے بھالے حسین پر
ٹوٹے ہوئے تھے برچھیوں والے حسین پر
یہ دُکھ نبیؐ کی گود کے پالے حسین پر
قاتل تھے خنجروں کو سنبھالے حسین پر
تیرِ ستم نکالنے والا کوئی نہ تھا
گرتے تھے اور سنبھالنے والا کوئی نہ تھا

آخر وہ وقت آگیا جو اس عالمِ ناسوت میں ہر شخص کے لئے ایک نہ ایک روز آ کے رہتا ہے۔

گرتے ہیں اب حسینؑ فرس پر سے ہے غضب
نکلی رکاب پائے مطہّر سے ہے غضب
پہلو شگافتہ ہوا خنجر سے ہے غضب
غش میں جھکے، عمامہ گرا سر سے ہے غضب
قرآں رحلِ زیں سے سرِ فرش گر پڑا
دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی، عرش گر پڑا

چشمِ ظاہر بیں نے یہ دیکھا کہ حسینؑ قتل ہوئے۔ اور یزید کا لشکر غالب آ گیا۔ لیکن کیا یہ حقیقت تھی؟

نہیں ـــــ حقیقت صرف ایک ہے جو اُس وقت سے آج تک باقی ہے اور آج سے قیامت تک باقی رہے گی۔

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حسینؑ کے قتل سے اِسلام کو نیا خون ملا۔ نئی زندگی ملی، نئی آب و تاب حاصل ہوئی۔ اگر حسینؑ نے کربلا کے ریگ زار میں اپنا خون نہ بہایا ہوتا تو آج اسلام کی صورت کچھ اور ہوتی۔

کربلا کی خاک کچھ نہ تھی، مگر حسینؑ کا خون بہنے کے بعد مقدّس ہو گئی۔

اے کربلا کی خاک اُس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاشِ جگر گوشۂ رسولؐ

یہ ہے وہ میراثِ مُسلمانی، جو کربلا کی خاک سے مُسلمانوں کو ملی ہے۔ اور جس کا تحفظ وہ ہر دَور میں کرتے چلے آئے ہیں۔

اِمام رازیؒ اور چنگیز

وہ بلدہ کہ فخرِ بلادِ جہاں تھا
عراقِ عرب جس سے رشکِ جناں تھا
پڑی خاکِ ایتھنز ہیں جاں ہمیں سے
ہوا زندہ پھر نامِ یوناں ہمیں سے
وہ لقمان و سقراط کے دُرِّ مکنوں
وہ اسرارِ بقراط و درسِ فلاطوں
ارسطو کی تعلیم، سولن کے قانوں
پڑے تھے کسی قبرِ کہنہ میں مدفوں
یہیں آ کے مہرِ سکوت انکی ٹوٹی
اسی باغِ رعنا سے بُو ان کی پھوٹی
یہ تھا علم پر واں توجّہ کا عالم

کہ ہو جیسے مجروح چویائے مرہم
کسی طرح پیاس ان کی ہوتی نہ تھی کم
بجھاتا تھا آگ ان کی باران شبنم

حریم خلافت ہیں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

ایران کی تہذیب، روم کا تمدّن اور یونان کا علم، افسانۂ پارینہ بن چکا تھا۔

دُنیا جہالت کی تاریکی میں گھری ہوئی تھی۔ تہذیب پر درندگی کی حکومت تھی۔ علم پر جہل غالب تھا۔

دین و مذہب کی صورت توہمات اور روایات نے مسخ کر دی تھی کہ دفعتہً مطلعِ عالم پر ایک نئی روشنی چمکی۔ اسلام نمودار ہوا۔

اسلام انقلاب فکر و نظر کا ایک زندہ اور متحرک پیغام تھا۔

اِسلام نے دنیا کو وہ چیز دی جس سے اپنی کج فہمی اور نادانی کے باعث وہ محروم ہو چکی تھی ـــــ ایک نئی تہذیب، ایک نیا تمدّن ایک نیا نظامِ حیات اور ـــــ

اور علم کا ایک نہ ختم ہونے والا جذبہ۔
اسلام نے ہر مسلمان کو علم سیکھنے کی ترغیب دی۔
اور اسے بتایا
کہ حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو!
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو!
اور مسلمانوں نے اس ہدایت کی ایسے جوش و خروش، دیانت اور راستی کے ساتھ تعمیل کی۔ جس کی نظیر تاریخ عالم کے صفحات پر مشکل سے ملے گی۔
جس زمانے میں یورپ کی قومیں اپنے شاگفتین علم کو شکنجہ میں کس رہی تھیں، آگ میں جلا رہی تھیں، پھانسی پر چڑھا رہی تھیں۔
اُس وقت اسلام کے پرستار علم کی شمع لے کر اس تیرہ خاک دان عالم کو منور کر رہے تھے۔
وقت کے بہت بڑے متکلم، فلسفی، مناظر، مفسر اور صوفی صافی امام رازی کا شمار بھی انہی لوگوں میں تھا جنہوں نے
علم کی شمع روشن کی۔
علم کو حیاتِ تازہ بخشی۔
امام رازی کی ولادت ۲۵ رمضان ۵۴۴ھ کو رے میں ہوئی

وہ ایک غریب لیکن معزز خاندان کے فرد تھے۔
اُنہوں نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے دائیں بائیں آگے اور پیچھے صرف غربت اور فلاکت پائی خاندان میں کوئی ایسا صاحبِ علم وفضل بزرگ نہ تھا۔ جو تمام علوم متداولہ کی انہیں تعلیم دے سکتا۔
لیکن امام رازی اِن مایوس کُن حالات سے ذرا بھی بددل نہیں ہوئے۔ اُنہوں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ علم حاصل کرینگے عالم بنیں گے۔ اور اپنے جذبۂ ملّی کا نام روشن کریں گے۔
سخت سے سخت حوصلہ شکن اور رُوح فرسا حالات بھی ان کے عزم کو نہ کچل سکے۔
اُنہوں نے فقر و فاقہ کے عالم میں بھی اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔
آج سے آٹھ سو برس پہلے سفر کرنا موت کے مُنہ میں کودنا تھا۔
لیکن امام رازی سفر کی صبر آزما دشواریوں اور مصیبتوں سے ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔
آج سے آٹھ سو سال پہلے حصول علم میں وہ آسانیاں، سہولتیں نہ تھیں، جو آج ہیں۔ نہ کالج تھے، نہ یونیورسٹیاں۔
شیخ اور اُستاد خود اپنی جگہ پر کالج اور یونیورسٹی کی حیثیت

رکھتے تھے۔

یہ شخصی درسگاہیں کسی ایک شہر میں مرکوز اور مجتمع نہ تھیں۔

فقہ کی تعلیم کا بہترین انتظام ایک شہر میں ہے تو ادب کا دوسرے میں۔ معانی و بیان کا کہیں اور فصاحت و بلاغت کا کسی اور جگہ۔ منطق و فلسفہ کا زاویہ کسی دُور دراز مقام پر آباد ہے، حدیث و تفسیر کا درس اس سے بھی دور کسی اور جگہ ملتا ہے۔ مسافت کے اعتبار سے یہ درسگاہیں ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر تھیں۔

پھر اس زمانہ میں، یعنی آج سے آٹھ سو سال پہلے نہ ریل تھی، نہ موٹر، نہ سیارہ نہ طیارہ۔ نہ دخانی کشتیاں، نہ موٹر لانچ۔

اس عہد میں یہ سارے سفر پا پیادہ طے ہوتے تھے یا اونٹ پر۔

امام رازی ایک غریب گھرانے کے فرد تھے، نہ اُن کے پاس زادِ راہ تھا نہ توشۂ سفر۔

امام صاحب کی متاع عزم مستقل اور جذبۂ صادق کے سوا کچھ نہ تھی۔ انہوں نے فاقے کئے۔ پھٹے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے۔ موقع مل گیا تو اونٹ پر بیٹھ گئے۔ ورنہ بڑے بڑے سفر پا پیادہ کرنے میں بھی ذرا نہ ہچکچائے۔

ایک جذبہ تھا جو اُنہیں آگے بڑھا رہا تھا۔ اور وہ بامراد ہو یا بامخالف

سب سے بے نیاز رواں دواں چلے جا رہے تھے۔

علم کی تلاش میں اُن کے جذبہ کا یہ عالم تھا کہ وہ راستے کی کٹھنائیاں جھیلتے ہر اُس شہر، قریہ، دیہات اور گاؤں میں پہنچے جہاں انہیں معلوم ہوا کہ علم ملے گا۔

وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں۔ ایک شہر سے دوسرے شہر میں، ایک قریہ سے دوسرے قریہ میں پہنچتے رہے تاکہ علم حاصل کر سکیں۔

کبھی وہ رے میں نظر آتے ہیں، مرند میں، کبھی سرخس میں۔ کبھی خوارزم میں، کبھی ماوراء النہر میں اور کبھی خجند میں کبھی بخارا میں کبھی سمرقند میں۔ نہ وہ تھکتے تھے، نہ یادِ وطن سے بیقرار ہوتے تھے۔ وہ اپنی دُھن میں مست تھے۔ انہیں صرف ایک ہی بات کی لگن تھی یہ کہ علم حاصل کریں۔ عالم بنیں۔ نام روشن کریں۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

امام رازی کی اس جہدِ مسلسل نے بہت جلد انہیں یکتائے روزگار عالم بنا دیا

وہ مختلف علوم و فنون کے ماہر تھے۔ وہ بہترین متکلم تھے۔ فنِ اسماء الرجال پر اُن کی بڑی اچھی نظر تھی۔

فلسفہ اُن کا خاص موضوع تھا منطق میں بھی وہ امام کی حیثیت رکھتے تھے۔ تفسیر کے فن میں انہوں نے اپنی نئی راہ نکالی۔ فن مناظرہ میں بھی وہ یکتا تھے۔ تصوّف کے بھی رمز آشنا تھے۔

غرض کوئی علم و فن ایسا نہ تھا جسے اُنہوں نے چھوڑا ہو۔ اور اس میں فنکارانہ استعداد نہ حاصل کرلی ہو۔ وہ ہر فن میں اُستاد اور شیخ کی حیثیت رکھتے تھے۔ فروتر اور ہیچ میرز کسی میں بھی نہ تھے۔

اپنے یگانۂ علم و فضل کے باعث نوجوانی ہی میں اُنہوں نے وہ مقام حاصل کرلیا جہاں تک پہنچتے پہنچتے عمریں صرف ہو جاتی ہیں۔

امام صاحب نے اپنے علم کو نہیں بیچا۔ اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا حق کے معاملہ میں وہ کسی سے نہیں دبے۔ سچّے بول ہمیشہ اُن کے مُنہ سے نکلے خواہ وہ سلطان وقت کا دربار ہو یا کسی امیر با تمکین کی مجلس۔

امام صاحب نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ وہ بڑے خود دار، بڑے قانع اور بڑے متوکل شخص تھے۔ غربت کا زمانہ انہوں نے اِس شان سے بسر کیا کہ اُن کے قریب رہنے والے لوگ بھی ان کی مالی حالت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔

پھر جب دن پلٹے، غربت دُور ہوئی، امارت اور دولت نے

قدموں کو بوسہ دینا شروع کیا، تو بھی نہ اُن کے پاس غرور پھٹکنے پایا، نہ دنیا پرستی کا جذبہ اُن کے اندر پیدا ہوا۔

وہ جس طرح غربت اور فلاکت کے زمانہ میں خدا کو یاد کرتے تھے اُس سے زیادہ اخلاص اور حُسنِ عمل کے ساتھ دولت اور وجاہت کے مالک بننے کے بعد وہ خدا کے نیک بندے بنے رہے۔ نہ غربت اُن کا دل توڑ سکی، نہ امارت اُن کے دل پر قبضہ کر سکی۔

امام صاحب کے علم و فضل نے جس طرح عوام کو اُن کا گرویدہ کر رکھا تھا اُسی طرح خواص بھی اُن کے تقدّس کے آگے سر جھکاتے تھے۔

جس طرح علماء۔ اتقیا، ابرار اور اکابر اُن کے پایۂ علم کے قدرشناس تھے اُسی طرح وقت کے ملوک و سلاطین بھی اُن کی بارگاہِ علم میں سر جھکا کر پہنچتے تھے۔

امام صاحب کے زمانہ میں خراسان، ترمذ، غزنہ اور خوارزم وغیرہ پر غوری اور خوارزم شاہی خاندان حکومت کرتا تھا۔

اِن دونوں حکمران خاندانوں نے ہمیشہ امام صاحب کی عظمت و منزلت کا اعتراف فروتنی اور نیازمندی کے جذبہ کے ساتھ کیا۔

غوری خاندان میں غیاث الدین اور شہاب الدین غوری اپنے لازوال کارناموں کے باعث تاریخ کا ایک مستقل عنوان بن چکے ہیں۔

یہ دونوں بھائی امام صاحب کی بہت زیادہ قدر و منزلت کرتے تھے۔
بہاء الدین سام حاکم بامیان سے قطع تعلق کر کے جب امام رازی اس
کی خدمت میں آئے تو وہ امام صاحب کے ساتھ نہایت عزّت و احترام
کے ساتھ پیش آیا۔ اُس نے امام صاحب کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ
فروگذاشت نہیں کیا۔ اُس نے چاہا کہ امام صاحب وہیں قیام فرما
ہو جائیں اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیں تاکہ ان کے فیض
سے یہ نواح بھی اہلِ علم کا ایک گوشۂ عافیت بن سکے۔
امام صاحب نے غیاث الدین غوری کی یہ استدعا قبول فرمالی۔ اُس نے
ہرات میں جامع مسجد سے متصل ایک شاندار مدرسہ تعمیر کرایا۔ جہاں امام
صاحب نے اپنا حلقۂ درس قائم کر دیا۔
امام صاحب کے علم و فن کی شہرت کے باعث دُور و دراز کے مقامات
سے علم کے طالب کھنچ کھنچ کر آنے لگے۔

ہر کجا بُود چشمۂ شیریں
مردم و مُرغ و مور گرد آیند

ہرات کے دورانِ قیام میں امام رازی نے مختلف عنوانات اور موضوعات
پر متعدد کتابیں بھی تحریر فرمائیں۔ اُن میں سے ایک کتاب اس
اختصاص کی بنیاد پر تھی جو امام صاحب کو غیاث الدین غوری سے

اور غیاث الدین غوری کو امام صاحب کی ذات گرامی سے تھا۔ یہ کتاب امام صاحب نے اُسی کے نام سے منسوب کر دی۔ اور اس کا نام "لطائف غیاثیہ" رکھا۔

جس طرح غوری خاندان کا جاہ و جلال اور تمکنت و وقار سلطان غیاث الدین اور شہاب الدین غوری کے دم سے تھا۔
اسی طرح خوارزم شاہی خاندان کی آن اور شان علاؤالدین خوارزم شاہ اور محمد بن تکش خوارزم کی ذات سے تھی۔
علاؤالدین ۵۶۸ھ میں تخت نشین ہوا اور بڑی مختصر مدت میں اُس کا رقبۂ سلطنت سندھ، ماوراءالنہر، خراسان اور بغداد تک پھیل گیا سلجوقیوں کی شانِ نعمت کا خاتمہ اس اولوالعزم فرمانروا کے ہاتھوں ہوا۔
اس کے بعد اس کا بیٹا محمد بن تکش اورنگ تخت نشین ہوا۔ اُس نے اکیس برس تک حکومت کی۔ اور اس مدت میں اس کی سلطنت کی حدیں اور پھیل گئیں۔
عراق سے لیکر ترکستان بلادِ غزنہ ہندوستان کے بعض حصے سجستان کرمان، طبرستان، جرجان، خراسان اور فارس وغیرہ سب اس کے

زیر اقتدار آ گئے۔

محمد بن تکش جس طرح بہت بڑا فاتح اور کشور کشا تھا اسی طرح ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا۔

وہ علماء و فضلاء کی تعظیم و توقیر کرتا۔ اُن کی صحبتوں اور مناظروں میں شریک ہوتا۔ وہ عالم تھا۔ علم کا قدر دان تھا۔ اور علماء کا سرپرست۔ محمد بن تکش خوارزم شاہ میں یہ خصوصیات اِس لئے تھیں کیونکہ وہ امام رازی کا شاگرد تھا۔

شہاب الدین غوری اور محمد بن تکش خوارزم شاہ کی زر پاشیوں نے اگرچہ امام صاحب کی غربت کو امارت سے بدل دیا تھا۔

لیکن علم سے انہیں جو لگاؤ پیدا ہو چکا تھا وہ برابر قائم تھا۔ درس و تدریس کا مشغلہ اس وقت بھی انہوں نے جاری رکھا۔

امام رازی کی مجلس اپنی اہمیت کے لحاظ سے سلاطین وقت کے درباروں سے کم نہ تھی۔

محی الدین غازی مزید بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام رازی سے ہمدان اور ہرات میں تعلیم حاصل کی۔ اُن کی مجلس میں بڑی شان پائی جاتی تھی۔ اور وہ بادشاہوں سے بھی بڑے نظر آتے تھے۔ جب وہ درس دینے کے لئے آتے تھے تو اُن کے اکابر تلامذہ مثلاً قطب الدین کشتی، قطب مصری

اور شہاب الدین نیشاپوری کی ایک جماعت اُن کے قریب بیٹھی تھی۔
ان کے متصل بقیہ تلامذہ اور دوسرے لوگ حسب مراتب بیٹھے تھے۔
امام صاحب علمی مباحثہ چھڑنے پر ایسی بحث کرتے تھے جس کی تعریف حدِ بیان میں نہیں آسکتی۔
امام رازی کے شاگردوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ جب امام صاحب کی سواری چلتی تو اس کے ساتھ تین سو شاگرد چلتے تھے۔
امام رازی کا درس و تدریس کے بعد دوسرا اہم مشغلہ مختلف اسلامی فرقوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ تھا
ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ہرات میں ان کی مجلس کے اندر مختلف مذاہب اور مختلف عقائد کے لوگ آ آ کر سوالات کرتے تھے۔ اور امام صاحب ہر ایک کا جواب ایسی خوبی اور شائستگی کے ساتھ دیتے کہ بات دل میں بیٹھ جاتی تھی۔
وہ جدال نہیں کرتے تھے قائل کرتے تھے۔ دلیلیں پیش کرتے تھے دل کی نبض پر ہاتھ رکھ دیتے تھے۔
امام صاحب کی گفتگو سے متاثر ہو کر لوگوں نے اپنا مسلک بدل لیا۔
امام رازی ایک عظیم المرتبت واعظ بھی تھے۔
ان کی مجلس وعظ میں حاضرین کی یہ کیفیت ہوتی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ

رہتی۔

امام صاحب کی مجالس وعظ میں امیر غریب، عوام و خواص، عالم اور فقیہہ، شاعر اور ادیب سب ہی شریک ہوتے تھے۔

امام رازی یگانۂ اور منفرد خصوصیات کے حامل تھے۔

وہ جس طرح ایک بہت بڑے خطیب، متکلم، مفسّر، عالم اور فلسفی تھے اُسی طرح ایک بہت بڑے مُصنّف بھی تھے۔

اُنہوں نے صدہا کتابیں لکھیں جو آج بھی اپنے موضوع پر قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

امام صاحب کی تصانیف میں اُن کی غیر فانی اور ہمیشہ زندہ رہنے والی کتاب قرآن کریم کی وہ طویل اور ضخیم تفسیر ہے جس کا نام اُنہوں نے مفاتح الغیب رکھا تھا۔ اور جو عام طور پر تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے۔

یہ تفسیر نہایت باریک خط میں بارہ (۱۲) جلدوں پر مشتمل ہے۔

اس کے علاوہ فن اصول دین، علم کلام، اصول فقہہ، فن اصول منطق، حکمت، الٰہیات، طبعیات، فلسفہ، اقلیدس۔ ہندسہ نجوم، طب، تصوّف۔ علم جدل وصدف۔ علم رمل علم فراست،

علم معانی و بیان، علم انساب و سوانح وغیرہ پر بہت سی کتابیں انہوں نے تحریر فرمائی ہیں۔

یہ کتابیں اپنی وقت نظر تحقیق اور وسعت معلومات کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہیں۔

امام صاحب کی تصانیف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پیچیدگی سے کام نہیں لیتے۔ ایسے سہل اور رواں طریقہ پر اظہار خیال کرتے چلے جاتے ہیں کہ بات سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں پیش آتی۔

مسلمانوں کی علمی تاریخ میں شیخ بوعلی سینا اور حکیم ابو النصر فارابی فلسفۂ ارسطو کے خاص شارح اور مفسر تسلیم کئے جاتے ہیں۔

امام رازی نے فلسفۂ ارسطو کی بنیاد ہلادی۔

لیکن یہ تردید صرف جذباتی نہ تھی، مدلل اور مستحکم بنیادوں پر تھی۔

امام رازی سے پہلے صرف دو قسم کے لوگ تھے۔

ایک وہ جو تمام مسائل میں حکمائے قدیم کی اندھا دھند تقلید کرتے تھے۔

دوسرے وہ جو حکمائے قدیم کے تمام مسائل پر اندھا دھند اعتراضات کرتے تھے۔

امام رازی نے ان دونوں راستوں کو ترک کرکے ایک نیا اور معتدل

راستہ اختیار کیا۔

اُنہوں نے فلسفہ کے قابل تائید مسائل کی تائید کی اور قابل تردید مسائل کی تردید فرمائی۔

وہ نہ فلسفے سے مرعوب تھے نہ اس کے نافہم دشمن۔

وہ اپنے علم، بصیرت اور فراست سے کام لینا جانتے تھے۔ انہیں اپنے علم اور بصیرت پر اعتماد تھا۔ وہ اپنے فکر و خیال کو خود پرکھنے کی استعداد اور صلاحیت رکھتے تھے۔

امام صاحب سے پہلے بھی اور امام صاحب کے زمانہ میں بھی لوگوں نے مذہب اور فلسفے کو ایک دوسرے کا حریف اور رقیب سمجھ لیا تھا۔

امام رازی نے اس غلط خیال کی دلائل واضح سے تردید کی۔ انہوں نے بتایا جس طرح سمندر میں تیرنے والی کشتی، اور خشکی پر دوڑنے والا گھوڑا ایک دوسرے سے نہیں ٹکرا سکتے اسی طرح مذاہب اور فلسفے میں بھی تصادم نہیں ہو سکتا۔ دونوں کی راہ جُدا ہے۔

امام صاحب نے مذہب کو اُس نرغے سے بچایا جو عقیدت کے پرستاروں کی طرف غلط اور بے بنیاد طور پر روا رکھا گیا تھا۔

امام صاحب نے علم کی خدمت بھی کی فلسفہ کو اس کا حق بھی دیا۔ اور مذہب کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔

امام رازی کی زندگی اس اصول کا نمونہ تھی کہ جو خدا سے ڈرتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔

وہ گج کلاہوں اور کشور کشاؤں کے دربار میں بھی پہنچے۔ مگر اس لئے نہیں کہ اُن کے سامنے سر جھکائیں۔

اس لئے کہ اُن کے دل میں مذہب کا احترام، خدا کا خوف اور علم کی منزلت پیدا کریں۔

وقت کے بڑے بڑے ملوک و سلاطین سے رابطہ اور تعلق قائم رکھنا پڑا۔

لیکن یہ ربط و تعلق کبھی بھی انہیں سچی بات سُنانے سے نہیں روک سکا۔

شہاب الدین غوری کی عظمت و جلالت اس کی ہیبت اور سطوت اس کی جاہ و مرتبت اور اس کے زور و قوت کا ایک دُنیا نے لوہا مانا۔

کسی میں ہمت نہ تھی کہ اُس کے سامنے لب کشائی کر سکے۔

کسی میں یارا نہ تھا کہ اُسے نصیحت کر سکے۔

وہی شہاب الدین جو جلال و تمکنت کا پیکر تھا۔ اپنے دربار میں وہی شہاب الدین امام رازی کی تعظیم و تکریم بہت زیادہ کرتا تھا۔

وہ امام صاحب کا جیب و دامن سیم و زر سے بھر دیا کرتا تھا۔

اُس نے امام صاحب سے استدعا کی کہ وہ اس کے لشکر میں کچھ عرصے

تک قیام فرمائیں اور ہر جمعہ کو وعظ کریں۔
تاکہ وہ خود بھی امام صاحب کے وعظ و پند سے مستفیض ہو۔ اور اُس کے لشکر کے لوگ بھی۔
امام صاحب نے یہ استدعا منظور فرمالی۔
جمعہ کے دن جامع مسجد میں یوں بھی ہجوم بہت زیادہ رہتا ہے لیکن آج اِس لئے خلقت ٹوٹی پڑ رہی تھی کہ امام رازی کے بارے میں شہرہ تھا۔ کہ وہ وعظ کہیں گے۔
خود سلطان شہاب الدین بڑے اشتیاق اور اہتمام کے ساتھ امام صاحب کے سامنے یعنی پہلی صف میں بیٹھا تھا۔
امام صاحب کا وعظ شروع ہوا۔ انہوں نے وعظ کے دوران میں سلطان کو مخاطب کر کے فرمایا ــــ "اے سلطان عالم! نہ تیرا یہ اقتدار اور دبدبہ ہمیشہ قائم رہے گا، نہ رازی کا یہ تملّق و نفاق باقی رہے گا۔ ہم سب کو ایک دن مرنا اور اُس کے سامنے جانا ہے۔ وہاں جانے سے پہلے جو کچھ کر سکتا ہے کر لے۔"
شہاب الدین نے یہ الفاظ سُنے اور رو پڑا۔ کیفیت یہ تھی کہ اُس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی تھی، لیکن آنکھیں تھیں کہ سیلِ اشک بہا رہی تھیں۔

امام رازی کی ساری زندگی محراب و منبر کی خدمت کرتے گزری۔
وہ گوشہ نشینی کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔
وہ ہزاروں کے مجمع میں تقریریں کرتے تھے۔
وہ لوگوں کے بے پناہ ہجوم میں مناظرے کرتے تھے۔
وہ علم مجلسی کے ماہر تھے۔
لیکن ایک واقعہ اُن کی زندگی میں ایسا پیش آیا جو بے حد انقلاب انگیز ثابت ہوا۔
جس نے امام صاحب کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔
یہ ایسا واقعہ تھا جس نے امام صاحب کے دل کی دنیا ہلا ڈالی۔
اور اُنہوں نے ایک نئی زندگی شروع کر دی۔
ایک مرتبہ امام رازی ہرات تشریف لائے۔
امام صاحب کی تشریف آوری سے پہلے ان کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی۔
امام صاحب کے دیدار کے لئے خلقت اُمڈی پڑ رہی تھی۔
علماء، امراء، غربا اور ہر طبقے کے لوگ استقبال کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ کر رہے تھے۔
امام صاحب بھی اپنی منزلت سے واقف تھے۔ اُنہوں نے دریافت

فرمایا" کیا ہرات میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جو مجھ سے ملنے نہیں آیا ؟"

جواب میں بیان کیا گیا۔ ایک مرد صالح اپنے گوشۂ عافیت سے باہر نہیں نکلا۔ وہ کبھی نہیں نکلتا۔ کسی سے نہیں ملتا۔ کسی کے پاس نہیں جاتا۔

امام صاحب نے فرمایا۔ میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔

اور دوسرے روز امام صاحب اور اُس شخص کی ملاقات کا انتظام کیا گیا۔

امام صاحب نے دریافت کیا۔ آپ اپنے شہر کے خواص اور عوام کی طرح مجھ سے ملنے کیوں نہیں تشریف لائے ؟

اُس مرد درویش نے کہا۔ نہ میری ملاقات سے آپ کا شرف بڑھتا، نہ میری عزّت میں اضافہ ہوتا۔ اس لئے ملاقات کی میں نے ضرورت نہ سمجھی۔

امام صاحب نے سکوت فرمایا۔ اُس مرد خدا نے کہا، آپ کا سرمایۂ فخر علم ہے۔ لیکن کیا خدا کی معرفت راس العلوم نہیں۔

امام صاحب نے فرمایا۔ "ہاں خدا کی معرفت راس العلوم ہے۔"

مرد قلندر نے پوچھا" پھر آپ نے خدا کو پہچانا؟

امام صاحب نے فرمایا۔ خدا کے وجود پر کم از کم سو دلیلیں میرے پاس موجود ہیں۔

وہ بولا۔ دلیل کی ضرورت شک کو زائل کرنے کے لئے ہوتی ہے الحمد للہ کہ میرے دل میں شک کا گذر ہی نہیں ہو سکتا۔ کہ مجھے دلیل کی حاجت ہو۔

اِن الفاظ نے امام صاحب کے قلب پر کچھ ایسا اثر کیا کہ اُسی وقت اُنہوں نے اس مردِ مومن کے دستِ حق پرست پر توبہ کی۔ اور بیعت کا شرف حاصل کیا۔ برکات تصوف کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ اور ہجوم کی زندگی چھوڑ کر خلوت نشین ہو گئے۔

دُنیا اس مردِ صالح کو حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ قدس اللہ سرہٗ العزیز کے نام سے جانتی ہے۔

(دُور کسی مسجد سے اذان کی آواز کے آخری الفاظ سنائی دیتے ہیں)

اللہ اکبر اللہ اکبر

ارے بھئی مغرب کی اذان ہو گئی، سُنی یا نہیں ؟

سُن لی بھائی۔

تو کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، چلو، ورنہ ——
چلو ۔ (غم انگیز آواز میں) میں یہ سوچ رہا تھا کیا یہ مسجد بھی ڈھا دی جائے گی۔ کیا اذان کی آوازیں اس دیس میں اب پھر بھی بلند ہو سکیں گی؟ کیا مسلمان اس شہر میں زندہ رہ سکیں گے؟
آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟
(ٹھنڈی سانس بھر کر) تمہیں معلوم نہیں، خوارزم شاہ کو چنگیز خاں کے لشکر نے شکست دیدی ہے۔
ہاں معلوم ہے۔ کتنا بڑا اور کتنا دل دوز سانحہ ہے یہ بھی!
اور شاید تمہیں ایک اور بات بھی نہیں معلوم؟
کون سی بات؟
تاتاریوں نے چنگیز خاں کی سربراہی میں بلادِ عجم کو تباہ و برباد کر دیا۔ قلعے ڈھا دیئے۔ شہر ویران کر دیئے۔ کھیتوں میں آگ لگا دی۔ باشندوں کو قتل کر دیا۔ عورتوں کو لونڈی بنا لیا۔ اور اب ——
اور اب ——؟
(گھبرا کر) اور اب؟
(بھرائی ہوئی آواز میں) اور اب تاتاریوں کا ٹڈی دَل، ہرات کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کون روک سکتا ہے اس طوفان کو ——!

علم کے دربار میں آتے ہوئے جہالت اور درندگی، وحشت اور
سفاکی، خوں آشامی اور بہیمیت کے بھی پاؤں لڑکھڑاتے ہیں۔

محمد بن قاسم

کردار

حجاج بن یوسف

سفیر خلافت

راجہ داہر

ہندوستان کی سرزمین پر ہزارہا سال تک عظمت و اقبال کا آفتاب چمکتا رہا۔

قدرت نے اس دیس کو ہر نعمت فراوانی سے عطا فرمائی تھی۔

یہاں کے اُونچے اُونچے پہاڑ، ان کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں اُن پہاڑوں کی گپھائیں اور غار۔

یہ وہ سرزمین تھی جس کے سمندروں کی تہہ میں آبدار موتی اِس طرح جھلملاتے جیسے اندھیری رات میں تارے۔

جس کی خشکی پر سونا یوں چمکتا تھا جیسے غروب کے وقت سورج کا زرد تھال۔

جس کے پہاڑوں میں یاقوت اور الماس کے دفینے تھے۔ جس کے جزیرے کافور اور عود سے مہکتے رہتے تھے۔ جس کے شہروں میں

راجوں اور مہاراجوں کے سنگھاسن تھے جس کے لوہے کی تلواریں اور زرہیں دور دور تک مشہور تھیں۔

یہاں کے لوگ علم اور عقل میں اپنے آپ کو ساری دنیا سے آگے سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا، اس دنیا کی ہم سے ابتدا ہوئی۔ ہمیں پہ انتہا ہوگی۔

اِس دیس کے لوگوں کا دعویٰ تھا کہ ساری دُنیا میں سب سے پہلے ہم نے سوچا، ہم نے لکھا، ہماری گویائی نے کلام کا آغاز کیا۔

لیکن جس طرح اس دُنیا کی کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں اسی طرح قومیں اور ملتیں بھی عروج کے بعد زوال سے، کامیابی کے بعد ناکامی سے، عظمت کے بعد پستی سے دوچار ہوتی ہیں۔

ہندوستان بھی اب اسی منزل پر پہنچ رہا تھا۔ اس کی عظمت بہت جلد افسانۂ پارینہ بننے والی تھی۔ اس کا مذہب گورکھ دھندا بن چکا تھا۔

ہندوستان کا سب سے بڑا مذہبی اور سماجی انقلاب جو بُدھ مت کے نام سے پردۂ ظہور پر نمودار ہوا تھا، ناکام ہو چکا تھا۔

بُدھ مت کی سادگی کو برہمنیت نے شکستِ فاش دے دی تھی۔

نہ صرف مذہبی رسوم کی بجا آوری بلکہ زندگی کے تمام معاملات پھر برہمنوں کے پنجۂ اقتدار میں آ گئے تھے۔ قدم قدم پر قربانیاں، کفّارے،

تعصب اور تنگ نظری۔ بدھ کی تمام صلاحات ختم ہو چکی تھیں۔ ذات پات کی جکڑبندیاں اور زیادہ شدید ہوگئی تھیں۔ ایک گھر کے لوگ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا نہ کھا سکتے تھے۔ ایک خاندان کے لوگ آپس میں شادی بیاہ نہ کر سکتے تھے۔ بتوں پر انسانی زندگی کی قربانیاں عام ہوگئی تھیں۔

اور اندر ہی اندر سیاسی اور مذہبی طوفان بھی انگڑائیاں لے رہا تھا۔ ایک طرف ہندوستان ایک ہزار سے زیادہ آزاد اور خودمختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔

اور دوسری طرف وہ مذہبی کشمکش تھی جس نے راجہ اور پرجا میں اختلاف و منافرت کی خلیج پیدا کر دی تھی۔

یہاں عوام کی غالب اکثریت اب تک بدھ مت کی پیرو تھی۔ اور حکومت برہمنوں کے ہاتھ میں تھی۔

اشوک کی نصب کی ہوئی لاٹیں موجود تھیں۔ اس کے لکھے ہوئے کتبے موجود تھے۔ اس کے عدل و انصاف کا نقش ناتمام "چکر" کی صورت میں موجود تھا۔

لیکن جس مذہب کو اشوک نے ہندوستان کے باہر عراق، ایران افغانستان تک پھیلا دیا تھا۔ وہ خود اپنے وطن ہندوستان میں

دم توڑ رہا تھا۔

جس برہمنیت کے خلاف اشوک اور اس کے بانیٔ مذہب مہاتما بُدھ نے کامیاب جہاد کیا تھا۔ وہی اب پوری قوت و طاقت، سفاکی اور شقاوت کے ساتھ پھر حکمراں تھی۔

اِس واقعہ نے بُدھ مت کے پیروؤں کے دلوں میں ہلچل پیدا کردی تھی۔ وہ اپنی محکومی سے عاجز آ چکے تھے۔

وہ بُدھ کی مورتیوں اور بتوں کی طرف دیکھتے تھے اور زبانِ حال سے کہتے تھے۔

"اگر حق کا بول بالا ہوتا ہے۔ اگر صداقت کو آنچ نہیں آتی، اگر سچائی کا جھنڈا اُونچا رہتا ہے۔

تو ہمارا پرچم سرنگوں کیوں ہے؟

ہماری سچائی پامال کیوں ہے؟ صداقت کامرانی کی منزل تک کیوں نہیں پہنچتی؟

بُدھ مت کے پیرو مصائبِ گوناگوں کے شکار تھے۔ ان کی تعداد برہمنی مذہب کے پیروؤں سے زیادہ تھی۔ لیکن اچھوتوں سے بدتر زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی بے عزّتی کی جاتی تھی۔ انہیں املاک و جائداد سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اُنہیں زبردستی ترکِ وطن پر مجبور کیا جاتا تھا

وہ ایسی فضا کے متمنّی تھے جہاں آزادی سے وہ اپنے مذہبی رسوم انجام دے سکیں۔

وہ ایسی حکومت چاہتے تھے جو اُن کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کرے۔

وہ ایسی سوسائٹی اور ایسے سماج کے جویا تھے جہاں اُونچ نیچ کا امتیاز نہ ہو۔ جہاں علم کے حصول پر پابندیاں نہ ہوں۔ جہاں ذات پات کی تفریق نہ ہو، جہاں چھوت چھات نہ ہو۔ جہاں خالق اور مخلوق، عبد اور معبود کے درمیان کوئی برہمن حائل نہ ہو۔

جہاں مذہب کسی خاص خاندان یا گروہ کی میراث نہ ہو۔

جہاں اخلاق و کردار کو نظر انداز کر کے نسل اور خون کو اہمیت نہ دی جاتی ہو۔

جہاں انسان کی حیثیت سے سارے انسان برابر ہوں۔

جہاں بزرگی، عظمت اور سربلندی کا معیار انسان کے صفات ہوں کردار ہو، نہ کہ نسل اور خاندان۔

جہاں پست ہمیشہ کے لئے پست نہ ہو، بلکہ اُسے پورا موقع ہو کہ اپنی صلاحیت کے بل پر بلندی کی انتہا تک پہنچ سکے۔

جہاں بلند دائمی طور پر بلند اور ایسا بلند نہ ہو کہ اخلاق و کردار

کی پستیاں بھی اس کی بلندی کو زائل نہ کر سکیں۔

جو کچھ، وہ چاہتے تھے وہ صرف اسلام ہی اُنہیں دے سکتا تھا۔

قرآن کا ارشاد ہے اِنّ اکرمکم عند اللہِ اتقاکم ۔ یعنی اسلام کے نزدیک بزرگی کا معیار صرف تقویٰ ہے

اِسلام کے داعی نے وقت کے رئیسوں اور غریبوں، دولتمندوں اور مُفلسوں کے سامنے صاف اور واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا۔ کلُکُم آدم و آدم من تراب "۔ تم سب اولادِ آدم ہو۔ اور آدم اسی خاک کے پُتلے تھے۔

وہ اسلام ہی تھا جس نے صاف اور غیر مشتبہ طور پر اعلان کر دیا تھا "لا اکراہ فی الدّین "۔ دین اور مذہب کے معاملہ میں کسی پر جبر و جور کرنا بہت بڑا جُرم ہے۔

اسلام نے یہ اعلان عین اُس وقت کیا جب دنیا میں دین و مذہب کی تبلیغ و ترویج کا سب سے بڑا ذریعہ تلوار تھی۔

عیسائیت، یہودیت پر عرصۂ زندگی تنگ کر رہی تھی۔ بُت پرست اہلِ کتاب کو اپنے ظلم و تعدی کا نشانہ بنائے ہوئے تھے۔ برہمنیت بُدھ مت اور جین مت کو سفّاکی اور شقاوت کا ہدف بنائے ہوئے تھی۔

مذہب کے اس اختلاف نے خون کے سمندر بہائے۔ کٹے ہوئے سروں کے مینارے تعمیر کرائے۔ کھیتوں میں آگ لگائی۔ گھروں کو جلا دیا۔ بیگناہ اور معصوم بچوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔

اِسلام کا قافلۂ امن اپنے وطن سے باہر نکل چکا تھا۔ لیکن اب تک اس نے ہندوستان کی سرزمین پر پڑاؤ نہیں ڈالا تھا۔

البتہ اِکّا دُکّا مسلمانوں کے قدم اِس دیس کے بعض ساحلوں تک پہنچ چکے تھے۔

یہ مُسلمان تاجر اور سیّاح تھے۔

اسکندریہ سے چین تک ان کی جولان گاہ تھی۔ بحیرۂ روم میں اسکندریہ بحرِ احمر میں جدّہ، حدیدہ اور عدن، خلیج فارس میں بصرہ، جزیرہ ہرمز، بحیرہ عرب میں دیول، سومنات، کھمبات، بھروچ، تھانہ، بحرِ ہند میں کالی کٹ، لنکا، مالدیپ، مسلمان تاجروں کے جہازوں سے پُررونق رہتے تھے۔

اِن منچلے مسلمانوں کا مقصد سیر و سیاحت یا تجارت ہوتا تھا۔

لیکن یہ نادانستہ طور پر اسلام کے پیامبر بن کر پہنچتے تھے۔

ان کی زندگی آلائشوں سے پاک تھی۔ ان کے اخلاق بلند اور برتر تھے۔

اِن کا کردار روشن اور تابناک تھا۔ ان کا ظاہر اور باطن آئینہ کی طرح
صاف و شفّاف تھا۔

ان مسلمانوں کی سادگی، ان کا تقویٰ، ان کی صداقت۔ ان کی سیاست،
ہر چیز میں ایک کشش تھی۔ ان کی پیشانی پر سجدوں کے نشان تھے، ان
کے چہروں پر ریاضت کا نُور برستا تھا۔

دل خود بخود ان کی طرف کھنچتے تھے۔ سر اُن کے احترام میں جُھک جاتے تھے۔

یہ ایک عجیب نظامِ حیات کے مالک تھے۔ ان میں ہر فرد امام بھی تھا اور
مقتدی بھی۔ سردار بھی اور سپاہی بھی۔ امیر بھی اور مامور بھی۔

اُن کا سب سے بڑا ان کے سب سے چھوٹے سے اس طرح ملتا تھا جیسے
بھائی سے بھائی۔ ان کا سب سے چھوٹا اُن کے سب سے بڑے سے
یوں پیش آتا تھا جیسے برابر کا دوست اور ساتھی۔

مساوات کا یہ دلکش منظر ان لوگوں نے دیکھا جن کے دیس میں چاند، سورج
اور تاروں کے بیٹے تھے۔ جو موروثی طور پر بڑے تھے۔ جن کی بدترین
غلطی بھی سزا اور تعزیر سے بالا تھی۔ اِس لئے کہ یہ دیوتاؤں کے
خاندان سے تھے۔ دیوتاؤں کی اولاد سمجھے جاتے تھے۔

اب وقت آگیا تھا کہ یہ طلسم ٹوٹے اور انسانیت کا بول بالا ہو۔

آخر کار اسلام کا سیل تند رَو کوہ و بیابان کو پار کرتا ساحلِ ہند کی طرف بڑھنے لگا۔

اس کے ہاتھ میں امن اور مساوات کا پرچم تھا۔ اس کے جلو میں عدل و انصاف کی فوج تھی۔

دُنیا کے ملوک و سلاطین خلیفۂ اسلام سے دوستی کے طلبگار رہتے تھے۔

یہی خواہش لنکا کے راجہ کی بھی تھی۔ لیکن یہ خواہش دل ہی دل میں پروان چڑھتی رہی۔ عملی جامہ نہ پہن سکی۔

آخر کار ایک موقع پیدا ہوا۔ لنکا میں جسے عرب "سیلان" کہتے تھے اور جواب "سیلون" کہلاتا ہے مُسلمان تاجروں کی ایک چھوٹی سی تعداد آباد تھی۔ یہ لوگ اپنے اہل و عیال سمیت یہاں رہتے تھے۔

ایک مسلمان تاجر کا انتقال ہو گیا۔ لنکا کے راجہ نے اُس کی بیوہ، یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کو بہت سے تحفوں اور ہدیوں کے ساتھ خلیفہ ولید بن عبدالملک کی خدمت میں روانہ کر دیا۔

جس جہاز میں لنکا سے یہ قافلہ روانہ ہوا تھا وہ جب سندھ کی مشہور بندرگاہ دیول کے قریب پہنچا تو سندھ کے بحری قزاقوں نے اُسے لوٹ لیا۔ بردوں اور عورتوں کو قیدی بنا لیا۔ ان قیدیوں میں ایک

قبیلہ یربوع کی ایک عورت بھی تھی۔ وہ بے اختیار پکار اُٹھی:۔

عورت:۔ اے حجاج تو کہاں ہے؟

اور جب یہ خبر خلیفہ ولید بن عبدالملک کے گورنر حجاج بن یوسف ثقفی کو پہنچی تو وہ جوش سے بے تاب ہوگیا۔ اور دیوانہ وار کہہ اُٹھا۔

حجاج:۔ میں نے سُن لیا ـــــ میں آیا!

اموی دور حکومت نے جو طاقتور سردار پیدا کئے ان میں حجاج بن یوسف سب سے ممتاز تھا۔ سرکشوں کی گردنیں خود بخود اُن کے سامنے جُھک جاتی تھیں۔ اور اگر جُھکنے میں تامل کرتی تھیں تو کاٹ لی جاتی تھیں۔

اُس نے فیصلہ کر لیا، وہ سندھ کے راجہ داہر کو اس مسلم آزادی کی سزا دے گا۔ اُسے سبق دے گا کہ ایک مسلمان کی حرمت کیا معنی رکھتی ہے۔

حجاج نے کہا۔ میں راجہ داہر کو بتاؤں گا مسلمان کا خون اس کی زندگی اس کی عزت، اس کا ناموس اور اس کا وقار کیا چیز ہے۔ اس کے حفظ و بقا کے لئے سارا نظامِ خلافت حرکت میں آسکتا ہے۔ خلافتِ اسلامیہ کے عساکر قاہرہ ہفتوں کی منزلیں دنوں میں طے کرتے اس کے سر پر پہنچ سکتے ہیں۔ اور اُسے کیفر کردار تک پہنچا سکتے ہیں لیکن حجاج اپنی سختی و درشتی کے باوجود مسلمان تھا۔ وہ اگرچہ جنگ پر آمادہ تھا۔ پھر بھی اتمام حجت کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اُس نے راجہ

داہر کے پاس ایک سفارت بھیجی۔

سفیر راجہ داہر کے پاس پہنچا۔ اور اُس نے نرم و ملائم الفاظ میں کہا۔

سفیر:۔ میں خلافتِ اسلامیہ دمشق کی طرف سے ایک پیام اور ایک مطالبہ لایا ہوں۔

داہر:۔ کہو، کیا کہنا چاہتے ہو ــــ ؟ ہم تمہارا پیام سُنیں گے۔ تمہارے مطالبہ پر غور کریں گے۔

سفیر:۔ ہماری حکومت آپ سے اخلاص و رفاقت کے تعلّقات استوار کرنا چاہتی ہے۔ اور اُس کا دوستانہ مطالبہ یہ ہے کہ سندھ کے بحری لٹیروں نے جن مُسلمان مردوں اور عورتوں کو گرفتار کر لیا ہے اُنہیں واپس کر دیا جائے۔

یہ الفاظ سُن کر راجہ داہر کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔ اس نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔

داہر:۔ میرا ان لٹیروں سے کیا تعلق۔ میں ڈاکوؤں اور لٹیروں کا بادشاہ نہیں ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔

سفیر:۔ کیا بے قصور اور بے گُناہ مُسلمان غلام بنا لئے جائیں گے ؟

داہر:۔ میں نہیں جانتا۔

سفیر:۔ کیا آپ مظلوموں کی بجائے ظالموں کا ساتھ دیں گے ؟

داہر:۔ میں کسی کا ساتھ دینا نہیں چاہتا۔

سفیر:۔ کیا آپ کے راج میں عدل اسی طرح کیا جاتا ہے۔ بیکسوں کی داد رسی یوں ہی کی جاتی ہے؟

داہر:۔ تم اپنا لشکر لاؤ اور اُن لٹیروں سے نپٹ لو۔

(داہر ہنسنے لگا اس کے درباری بھی ہنستے لگے)

سفیر:۔ ہم نے اتمام حجّت کر دیا۔

داہر:۔ اب کیا کر لو گے۔ کیا اپنا لاؤ لشکر لے کر چل پڑو گے؟

سفیر:۔ اب ہماری آپ کی گفتگو ختم ہو چکی۔ اب ہمارے اور آپ کے نیزے باتیں کریں گے۔

داہر:۔ (غصّہ میں) تم بھول رہے ہو۔ کہ تمہارا مخاطب کون ہے۔ یہ دربار شاہی ہے۔ یہاں زبان درازی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ تم فوراً واپس چلے جاؤ۔ شکر کرو کہ سفیر تھے۔ ورنہ تمہارے بجائے تمہاری لاش یہاں سے جاتی۔

سفیر:۔ میں جاتا ہوں۔ اور بہت جلد پھر واپس آؤں گا۔ اس خدائے واحد و توانا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں ہر انسان کی جان ہے جب تک ایک مسلمان بھی زندہ ہے تم ہمارے کسی بھائی اور کسی بہن کو لونڈی یا غلام نہیں بنا سکتے۔ ہمیں اپنی عزّت و حرمت اپنی جان سے زیادہ عزیز

ہے۔ خون کے دریاؤں میں تیرنا اور ہتھیاروں سے کھیلنا ہمارا پرانا شغار ہے۔

داہر:۔ (بلند آواز سے) خاموش!

سفیر:۔ تم میری زبان نہیں بند کر سکتے۔ حق بات تمہیں سُننی پڑے گی۔

داہر:۔ (چلا کر) میں کچھ نہیں سُننا چاہتا۔ تم واپس چلے جاؤ اور اپنے بادشاہ تک میرا جواب پہنچا دو۔

حجاج کا سفیر واپس چلا گیا۔ اور راجہ داہر نے وسیع پیمانے پر جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

سفیر نے جا کر حجاج کو سارا ماجرا سُنایا۔ یہ باتیں سُن کر حجاج کا جوش انتقام بھڑک اُٹھا۔ اس نے حکومت سندھ کی سرکوبی کے لئے پہلے چند چھوٹی چھوٹی مہمیں بھیجیں۔

اور آخر اس کی نگاہِ انتخاب اپنے چچازاد بھائی محمد بن قاسم پر پڑی۔

حکم ملتے ہی اپنی فوج لے کر چل پڑا۔ فوجی ضروریات کی کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اس مہم کے لئے حجاج نے مہیا نہ کر دی ہو۔ حتّٰی کہ سوئی دھاگا تک سامان رسد میں موجود تھا۔

محمد بن قاسم نے ہلکا پھلکا سامان اپنے ساتھ رکھا۔ اور بھاری سازو

وسامان اور اسلحہ منجنیقیں وغیرہ بڑے بڑے جہازوں پر بار کرا کے
دیبل کی طرف روانہ کر دیا۔

فتح و ظفر اُس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وہ جہاں پہنچا کامیاب
ہوا۔ وہ اپنے بارے میں کہہ سکتا تھا "میں آیا۔ میں نے دیکھا۔
میں نے فتح کر لیا۔

اس لئے کہ وہ سچّا مسلمان تھا۔ اور سچّے مسلمان کی شان کچھ اور ہے

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

محمد بن قاسم سب سے پہلے مکران پہنچا۔ وہاں سے آگے بڑھ کر لس بیلہ
کے پائۂ تخت "ارماہیل" کو فتح کیا۔ اور یہاں سے وہ دیبل پہنچ گیا۔
یہ بڑی پُرانی بندرگاہ تھی۔ ایران، عراق عرب اور افریقہ کے جہاز اسی
ساحل پر لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔

محمد بن قاسم محض خدا کے بھروسے پر ایک بڑی مہم سر کرنے چلا تھا۔ وہ جس
ملک پر فاتحانہ یلغار کر کے بڑھ رہا تھا۔ وہ بالکل اجنبی تھا۔ وہاں کے پہاڑ
اور صحرا، جنگل اور دریا، میدان اور وادی، راستے اور گذرگاہ، سب انجان
تھے۔ لیکن ایک عزم تھا جو اُسے بڑھائے لئے چلا جا رہا تھا جس نے اُس کے
قدموں کو دریا کی روانی عطا کر دی تھی۔ وہ بگولوں سے لڑتا، آندھیوں سے

کھیلتا۔ طوفانوں کے تھپیڑے سہتا، سمندروں اور دریاؤں کو پھاندتا بڑھا چلا جا رہا تھا۔ خدا اس پر مہربان تھا۔ اور تقدیر اُس سے کہہ رہی تھی ؎

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ ہوائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

یہاں بدھوں کا ایک مشہور دیول یعنی مندر تھا۔ اسے عرب "دیبل" کہنے لگے جو اب تک تاریخ کے صفحات پر اس نام سے مشہور ہے۔
محمد بن قاسم نے اپنے لشکر کے اردگرد خندقیں کھدوا کر دیول کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ شہر قلعہ بند ہو کر جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ محمد بن قاسم کی منجنیقیں آگ کے گولے برسانے لگیں۔ ایک گولہ دیول کے گنبد پر گرا۔ یہ اتنی بڑی بدشگونی اور اتنا بڑا سانحہ تھا کہ سارے شہر میں تہلکہ مچ گیا۔ ہر شخص پر دہشت، سراسیمگی اور مایوسی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ سپاہی ہمّت ہارنے لگے۔ فوج میں افراتفری پیدا ہو گئی۔ شہریوں کے چھکّے چھوٹ گئے۔
مُسلمانوں کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ سیڑھیوں کے ذریعہ فصیلوں پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔

لیکن سندھی سپاہی تیروں کی بارش کر رہے تھے مسلمان تیر کھا کھا کر گر رہے تھے۔ لیکن آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

اسی اثنا میں قبیلۂ مراد کا ایک دلیر نوجوان کسان فصیل پر چڑھ گیا۔ فصیل پر چڑھتے ہی اس نے اسلامی پرچم لہرایا۔ اور اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا کہ اردگرد کی فضا لرز اٹھی۔

اس نعرہ نے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ وہ سخت ترین مزاحمت کے باوجود فصیل پر چڑھ گئے۔ وہاں سے پھاندے تو شہر میں تھے۔ اور اب سارا شہر ان کے زیر نگیں تھا۔

امن و امان قائم ہونے کے بعد محمد بن قاسم نے عفو عام کا اعلان کر دیا۔ رعایا کی دلدہی کی۔ اُسے عزت اور آسائش کی زندگی بسر کرنے کا موقعہ دیا۔ اور سب سے پہلا تعمیری کام یہ کیا کہ دیول میں مندر کو صحیح وسلامت چھوڑ کر اُس کے مقابل میں ایک وسیع اور کشادہ جامع مسجد تیار کرائی۔

اس سرزمین میں یہ پہلی مسجد تھی جہاں سے پہلی بار خدائے واحد کا نام لیا گیا۔

اور جہاں اس کے آخری رسول کا کلمہ پڑھا گیا۔

چند روز دیول میں قیام کرنے کے بعد محمد بن قاسم کا سیل رواں نیرون کی طرف بڑھا۔ جہاں کا حاکم داہر کا ماتحت تھا۔ بدھ مت کا پیرو تھا۔ عوام

بھی بُدھ ہی تھے۔ اُن کے کانوں تک فتح دیول کی خبر پہنچ چکی تھی۔
جیسے ہی محمد بن قاسم کا لشکر پہنچا، حاکم شہر بھارگن نے اطاعت قبول کرلی۔
اور کسی خوں ریزی کے بغیر اس بڑے شہر پر اسلامی فوجوں کا تسلّط ہوگیا۔
مُسلمان فوج حلم اور وقار کے ساتھ داخل شہر ہوئی نہ کسی گھر کو لوٹا گیا۔
نہ کسی عورت کی بے آبروئی کی گئی۔
نہ کسی کی گردن کاٹی گئی۔
نہ کسی کو جلا وطنی پر مجبور کیا گیا۔
اتنا بڑا انقلاب رونما ہوا کہ حکومت بدل گئی۔ حکومت کا مذہب بدل گیا۔ ایک غیر اجنبی اور نئی قوم نے تخت فرماں روائی پر قبضہ کرلیا۔
لیکن امن وامان کا یہ عالم تھا کہ کسی شہری کی نکسیر تک نہیں پھوٹی۔
نیروں کے لوگوں نے یہ دونوں کیفیتیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔
پھر یہ عالم ہوا کہ محمد بن قاسم جہاں پہنچتا تھا اُس سے پہلے اُس کی شہرت پہنچ جاتی تھی۔
اُس کے حُسنِ سلوک اور رواداری، ملاطفت اور نرمی، اخلاق اور

کردار نے سندھیوں کا دل موہ لیا تھا۔

وہ جہاں جاتا تھا، شہر کے دروازے اس کے لئے کھول دیئے جاتے۔ خلقت اُس کا اس طرح استقبال کرتی جیسے کسی قومی ہیرو کا کیا جاتا ہے غرض ایک مختصر سی مدّت میں محمد بن قاسم نے بہت سے قلعے، بہت سے علاقے، بہت سے شہر فتح کر لئے۔ اُس نے شمشیر و سنان کا استعمال کم کیا اخلاق و کردار کی طاقت استعمال کی۔

داہر کو اپنی قوت و شوکت کا زعم تھا۔ اپنی دولت، اپنے وسائل و ذرائع اپنے دیرینہ اور مستحکم تعلقات پر ناز تھا۔

محمد بن قاسم فتح پر فتح حاصل کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔

اور داہر یہ سمجھ رہا تھا کہ مسلمانوں کا لشکر جتنا جتنا اندرون سندھ میں بڑھتا جائے گا، اُتنا ہی اپنے مرکز سے دُور اور ہلاکت اور موت سے قریب ہوتا جائے گا۔

داہر اپنے پایۂ تخت کو ناقابلِ تسخیر سمجھتا تھا۔

اور اِدھر محمد بن قاسم اپنے مفتوحہ مقامات کو مستحکم کرتا، عقاب کی سی تیزی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

جن شہروں نے اطاعت قبول کر لی وہاں کے حاکم بھی بحال رہے۔ شہریوں کے مذہبی اور سماجی معاملات میں مُسلمان حاکم نے ذرا بھی

مداخلت نہیں کی۔

بڑے بڑے سردار داہر کا ساتھ چھوڑ کے محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔

قاصد نے عرض کیا۔ مجھے راجہ موکہ نے بھیجا ہے جو راجہ داہر کو خراج دیتا ہے۔

محمد بن قاسم نے پوچھا، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

قاصد نے کہا۔ ہمارے راجہ کو یقین ہو گیا ہے کہ یہ ملک اب ہمارے قبضہ میں نہیں رہ سکتا۔

محمد بن قاسم بولا، تمہارا راجہ دُور اندیش ہے۔

قاصد نے جُھک کر کہا۔ آپ نے صحیح فرمایا۔ اسی لئے ہمارے راجہ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ آپ کا ساتھ دے۔

محمد بن قاسم نے کہا۔ یہ فیصلہ بڑا مبارک ہے۔ لیکن وہ پھر میرے پاس کیوں نہیں چلا آیا۔

قاصد دوزانو ہو کے بولا۔ بغیر جنگ کے اگر وہ آپ کا ساتھ دے تو اپنے خاندان میں اور ہم چشموں میں ذلیل ہو جائے گا اور میں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہونگا۔

محمد بن قاسم نے پوچھا۔ پھر وہ کیا چاہتا ہے؟

قاصد نے کہا۔ وہ اپنی لڑکی کی شادی کا بہانہ کر کے ایک مختصر سے دستہ

سپاہ کے ساتھ ساکرڑا جا رہا ہے۔ ایک ہزار سپاہی بھیج کر اسے گرفتار کر لیجئے۔ وہ خوشی خوشی گرفتار ہو جائے گا۔

محمد بن قاسم نے فوج کا ایک دستہ ساکرڑا بھیج دیا۔ جہاں حسب قرارداد راجہ موکہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ محمد بن قاسم نے راجہ موکہ کو تحریر لکھ دی کہ اُس کی فرمانروائی نسلاً بعد نسلٍ قائم رہے گی۔

اس حُسنِ سلوک نے موکہ کو سچّا خادم اور وفادار بنا دیا۔

موکہ کا یہ خوشگوار انجام دیکھ کر بہت سے دل مسلمانوں کی عقیدت اور محبت سے لبریز ہو گئے۔

اب داہر کو احساس ہوا کہ وہ سمجھ کیا رہا تھا اور ہوا کیا؟ مسلمانوں کے پے در پے فتوحات نے اُسے ہراساں اور سراسیمہ کر دیا۔ اور اُس نے صلاح مشورہ کے بعد ایک لشکرِ جرار عربوں کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ یہ لشکر دریائے سندھ کے قریب آ کر خیمہ زن ہو گیا۔

محمد بن قاسم نے دریائے سندھ کو پار اُترنے کے لئے کشتیوں کا پُل بنانا چاہا۔ اُس نے دریا کے کنارے طول میں کشتیاں کھڑی کر دیں۔

جب رات کی تاریکی فضا پر چھا گئی تو ان کشتیوں کو عرض کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ جب یہ دریا کے بہاؤ پر پہنچیں تو تیزی کے ساتھ پار جا لگیں۔

تھوڑی سی مزاحمت کے بعد مسلمانوں نے راجہ راسل کی راج دھانی پر قبضہ کر لیا۔
راسل داہر کا خاص آدمی تھا۔ اور داہر کو اعتماد تھا جب تک راسل کو شکست نہ دی جائے مجھ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔
اس شکست نے راسل کو مایوس اور نا امید کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ داہر عیاش اور خود غرض ہے۔
وہ اپنے گورنروں کو نہ کمک بھیجتا ہے نہ اُن کی مدد کرتا ہے۔
اُسے زندگی عزیز ہے، لیکن اپنی۔
وہ خود موت سے بھاگتا ہے۔ لیکن اپنے آدمیوں کو موت کے خوفناک دہانے میں دھکیل دیتا ہے۔
مگر راسل نے بھی وہی کیا جو موکا نے کیا تھا۔ اُس نے اپنا قاصد محمد بن قاسم کے پاس بھیجا۔
قاصد نے عرضداشت پیش کرتے ہوئے کہا۔ اے سردار عرب! مجھے راجہ راسل نے تیری خدمت میں بھیجا ہے۔ کیا آپ اُسے معاف نہ کر دیں گے؟
محمد قاسم نے جواب دیا۔ اسلام توبہ کرنے والے کو کوئی سزا نہیں دیتا۔
قاصد بولا۔ آپ کی ذات اور کریمانہ اخلاق سے یہی توقع تھی۔ لیکن راجہ بدنامی سے ڈرتا ہے۔
موکا کی طرح راسل بھی برضا و رغبت گرفتار ہو گیا۔

داہر نے بھی اپنی فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ نقارہ جنگ زور زور سے بج رہا تھا۔ جنگی ہاتھیوں کا لشکر آگے آگے تھا۔ پیچھے دس ہزار مسلح سوار پھر تیس ہزار پیادہ فوج محمد بن قاسم کا لشکر داہر کے مقابلہ میں نصف سے بھی کم تھا۔

راجہ داہر ایک سفید ہاتھی پر سوار مرصع عماری کے بیچ میں شکوہ قاہرانہ کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ آس پاس حور شمائل اور پری چہرہ خواتین تھیں جو اُسے شراب سے بھرا ہوا پیالہ، پان کا بیڑا اور زہر میں بجھے ہوئے تیر دیتی جاتی تھیں۔

یہ رمضان کا مہینہ تھا، اور اسلام کے سرفروش سپاہی اور مجاہد خدا کے راستے میں اپنی جان قربان کر دینے کا تہیہ کئے ہوئے لڑ رہے تھے۔

اسی اثنا، میں جاں بازان اسلام کا نوجوانوں اور نوعمر سپہ سالار محمد بن قاسم نمودار ہوا۔ اُس نے اپنے لشکر پر ایک نگاہ ڈالی۔ اور پھر حمد و ثنا کے بعد کہا:۔

اسلام کے سرفروش سپاہیو! تم خدا کے راستے میں، جہاد کی نیت کر کے اپنے وطن سے سینکڑوں ہزاروں میل دور اس سرزمین پر آئے ہوئے ہو۔ تمہارے سامنے جو دشمن کی فوج ہے اس کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس کے ساز و سامان کی کوئی انتہا نہیں۔ ہر کونے، ہر چپے اور ہر گوشے سے اُسے تازہ دم کمک پہنچ سکتی ہے۔ اور تم ان تمام سہولتوں اور آسانیوں سے محروم ہو، پھر بھی تم فتح حاصل کرو گے۔ اور دشمن شکست پائے گا۔ کامیابی تمہارا

قدم چُومے گی۔ اور ناکامی اُس کے لئے جائے پناہ باقی نہ رکھے گی۔ اِس لئے کہ تمہیں موت عزیز ہے۔ اور اسے زندگی۔ تم آخرت پر جان دیتے ہو۔ اور وہ دُنیا کا طلبگار ہے۔ اے خدا ہم پر رحم کر، تو اپنے ان بندوں کو جو تیرے نام کی سربلندی کے لئے جنگ کے میدان میں کود ے ہیں۔ اپنے رحم و کرم سے ڈھانپ لے۔

(نقارہ جنگ، گھوڑوں کے ہنہنانے اور ہاتھیوں کی چنگھاڑ کا شور، ٹاپوں کی آواز، جے کاروں اور نعروں کا شور)

محمد بن قاسم:۔ دیکھو دیکھو دشمن کا لشکر بڑھ رہا ہے۔ تم اُسے آگے نہ بڑھنے دو، جو تم سے امان کا طالب ہو اُسے بخش دو۔ جو لڑنا چاہے اس کی گردن کاٹ لو۔ دیکھو خبردار! بچّوں، بوڑھوں، بیماروں اور عورتوں پر ہاتھ نہ اُٹھانا۔

(جنگ کا آغاز، کراہیں اور چیخیں)

جنگ شروع ہوگئی۔ عرب اپنے لمبے نیزے آگے کو جُھکائے ہوئے داہر کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ کسی کو سر تک کا ہوش نہ رہا۔ دن ختم ہوگیا۔ رات کی سیاہی پھیلنے لگی۔ داہر کے سپاہیوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہاتھیوں کو بڑھا کر ایک آخری زوردار حملہ کر دیا۔ ہاتھیوں کا ریلا عرب سپاہی نہ سہہ سکے۔ لیکن محمد بن قاسم نے آتش بازوں کو حکم دیا کہ پچکاریوں میں روغن نفط بھر کر ہاتھیوں پر پھینکیں۔ ہاتھی آگ کی اس بارش کو نہ سہہ سکے۔ اور راجہ

پورس کے ہاتھیوں کی طرح اپنی فوج کو روندتے اور پامال کرتے بھاگنے لگے۔
جنگ کا یہ دور دیکھ کر داہر ہاتھی سے کود پڑا۔ اور شمشیر بکف میدان جنگ
میں آگیا۔ لیکن اُس کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔ ایک عرب نوجوان کی شمشیر
آبدار نے عین جنگ کی گرما گرمی میں اسے قتل کر دیا۔ ایسا بھرپور ہاتھ پڑا کہ
تلوار سر سے گردن تک اُتر گئی۔

اب داہر کے ملک سندھ پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔

خدا جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

تؤتی الملک ممن تشاء وتنزع الملک ممن تشاء

محمد بن قاسم نے سندھ کے علاوہ ملتان کا علاقہ بھی فتح کر لیا۔ اور اپنی
مملکت پنجاب تک پھیلا دی۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے جلد واپس
چلا جانا پڑا۔ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور سلیمان جو اُس
کی جگہ خلیفہ مقرر ہوا۔ حجاج اور اُس کے خاندان کے لوگوں کا مخالف تھا۔
محمد بن قاسم کو کسی جرم کے بغیر قید کر لیا گیا۔ اور اس نے قید ہی میں وفات
پائی۔

جب محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا، اس کی عمر سترہ برس کی تھی۔ اُس کے
ہم سن لڑکے ابھی کھیل میں لگے ہوئے تھے۔ اور وہ فوجوں کی کمان کر رہا تھا۔
اُس نے بیسیوں شہر فتح کئے۔ سمندروں کو کھنگالا۔ پہاڑوں کو چیر ا۔ ریگستانوں

یں سے آندھی کی طرح گزرتا چلا گیا۔ لیکن اُسنے شہر ہی فتح نہیں کئے تھے، بلکہ دلوں کو بھی مسخر کر لیا تھا۔

وہ ایک نیا ضابطہ، ایک نیا قانون لے کے آیا تھا۔

انصاف اور رواداری کا قانون۔ عدل اور مساوات کا قانون۔ جس میں نسل اور خاندان کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ جس کی نظروں میں برہمن اور کھتری، ویش اور شودر کی حیثیت یکساں تھی۔

وہ اپنے ساتھ امن کی دولت لایا تھا۔ وہ دولت جس سے سندھ کے لوگ ناآشنا تھے۔

وہ اپنے ساتھ انصاف جیسی نعمت لایا تھا۔ وہ نعمت جو اہلِ سندھ کے لئے بالکل نئی تھی۔

اس کی موت پر اپنے ہی نہیں غیروں نے بھی آنسو بہائے۔

ہندوؤں نے اُس کی مورتی بنائی اور مدتوں اس کی پوجا کرتے رہے۔

کیونکہ اُنہیں شکر گزاری کا یہی ایک طریقہ معلوم تھا۔

کیونکہ اُنہوں نے اس میں ایسی باتیں دیکھی تھیں جو اُن کے عقیدے میں دیوتاؤں ہی سے منسوب کی جا سکتی ہیں۔

وہ اپنے آپ کو ایک حقیر انسان اور خدائے واحد کا عاجز بندہ کہتا تھا۔

لیکن سندھ کے لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ انسان ایسے بھی ہوتے ہیں

وہ لوگوں کو امن اور انصاف جیسی نعمتیں بھی دے سکتے ہیں۔

وہ حیران ہو ہو کے ایک دوسرے سے پوچھتے تھے۔ اگر وہ دیوتا نہیں تھا تو اس قدر جلد اتنی بڑی فوج کا سردار کیسے بن گیا؟

نوجوانی میں اُس نے عقل اور دانائی کی باتیں کیسے سیکھ لیں؟

اُس نے قلعہ بند شہر کیونکر فتح کر لئے۔ اتنی بڑی قوموں کو کیونکر زیر کر دیا۔

وہ انصاف اور امن کے بھرپور خزانے کہاں سے لے آیا؟

اسے کیسے معلوم ہو گیا کہ پرجا کیا چاہتی ہے؟ لوگ کن کن دکھوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔

پھر اُن کی نظریں بار بار سمندر کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ جن کی سطح پر جہازوں کے بادبان فراٹے بھر رہے تھے۔

اُنہیں یقین تھا کہ محمد بن قاسم پھر آئے گا۔ وہ نئے علاقے فتح کریگا جہاں جائیگا، امن اور انصاف کے موتی بکھیرتا چلا جائے گا۔

وہ انتظار کرتے کرتے بوڑھے ہو گئے۔ لیکن محمد بن قاسم پھر نہ آیا۔

ہاں البتہ جو نیا قانون وہ لایا تھا وہ آہستہ آہستہ سارے ملک میں پھیلتا جا رہا تھا۔

جلالِ حق کی صدا ملک کے گوشے گوشے سے اُٹھ رہی تھی۔ ذات پات کی زنجیریں کٹ رہی تھیں۔ پرانے ضابطے اور قاعدے مٹ رہے تھے۔ اور اسلام کا کارواں بڑی تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا۔

غزوۂ بدر

فرشتے یہ کل عرش پر کہہ رہے تھے
کہ کسریٰ و قیصر ہیں دربانِ احمدؐ
نہ دیکھی ہو تصویرِ رحمت کی جس نے
وہ دیکھے سراپائے رخشانِ احمدؐ
بنا ماہِ نو جُھک کے نعل اُس کے سُم کی
بڑھا جب سوئے بدر یک رانِ احمدؐ

(ظفر علی خاں)

مکّہ کی سرزمیں مسلمانوں پر تنگ ہو چکی تھی۔ وہ ہجرت کر کے، یعنی اپنے وطن، گھر، کھیتی، جائداد، مال، متاع، ہر چیز سے دست کش ہو کر مدینے میں غربت اور مہاجرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔
لیکن کفارِ مکّہ اب اس پر برہم تھے کہ مسلمان مدینہ میں امن و عافیت

کی زندگی کیوں بسر کر رہے ہیں؟ وہاں کی زمین بھی ان کے لئے تنگ کیوں نہیں ہو جاتی؟ وہاں کے پھول بھی اُن کے لئے کانٹے کیوں نہیں بن جاتے وہاں کے لوگ بھی اُن کی جان اور مال و آبرو کے گاہک کیوں نہیں ہو جاتے وہ چاہتے تھے مسلمان مدینہ سے نکال دیئے جائیں۔ وہ پھر مکّہ واپس آئیں اور وہاں اُن کو پھر پہلے سے زیادہ ننگِ انسانیت اور سفّاکانہ مظالم کا ہدف بنایا جائے۔

جب قریش کی یہ تمنّائیں بار آور نہ ہوئیں تو اُنہوں نے انصار مدینہ کو دھمکانا اور مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

۳ھ میں قریش نے ایک معمولی سے واقعہ کی آڑ لے کر مدینہ پر حملہ کرنے کا آخری اور قطعی فیصلہ کر لیا۔

وہ جانتے تھے، مسلمانوں کے پاس نہ جنگ کا ساز و سامان ہے نہ دولت و ثروت ہے۔ ان کے ختم کر دینے اور اُن کا نام و نشان مٹا دینے کا اس سے بہتر کوئی اور موقعہ نہیں مل سکتا۔

انہیں عیسائیوں، یہودیوں اور مدینہ کے منافقوں سے بھی ہر قسم کی امکانی مدد ملنے کی اُمید تھی۔

انہیں یہ یقین بھی تھا کہ انصار اپنے مہاجر بھائیوں کے لئے اتنا بڑا ایثار نہیں کر سکتے کہ ان کی تائید اور حمایت میں اپنی جان، مال، عزت، آبرو بلکہ وجود

تک کی بازی لگا دیں

مسلمانوں کو قریش کے عزائم کی اطلاع ملی۔ یہ خبر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سمع مبارک تک بھی پہنچی۔

آپؐ نے صحابہ کبار کے سامنے صورت حال رکھی اور مشورہ طلب فرمایا۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک ولولہ انگیز اور جاں نثارانہ تقریر کی۔

مگر آنحضرتؐ نے اس تقریر پر کسی خاص التفات کا اظہار نہ فرمایا۔

پھر حضرت عمرؓ نے وقت اور موقعہ کے لحاظ سے ایک تقریر کی۔ اور ہر قسم کی قربانی پر آمادگی کا اظہار فرمایا۔

اس مرتبہ بھی آنحضرتؐ نے کسی خاص توجہ کا اظہار نہیں فرمایا۔

یہ رنگ دیکھ کر انصار کے خزرج قبیلہ کے سردار حضرت سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا:۔

"کیا حضور کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ خدا کی قسم آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔ ہم وہ لوگ نہیں ہیں جنہوں نے موسیٰ سے کفار کا لشکر گراں دیکھ کر کہا تھا۔ تم اور تمہارا رب جا کر لڑے۔ ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔"

حضرت مقداد نے فرمایا "ہم آپ کے داہنے سے بائیں سے، سامنے سے اور پیچھے سے لڑیں گے۔"

یہ سنکر فرطِ مسرت سے آنحضرت کا چہرۂ مبارک چمک اٹھا۔

اب مسلمانوں میں بھی عام اس سے کہ وہ مہاجر ہوں یا انصار، اسلام کی حرمت پر کٹ مرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

۱۲ رمضان ۲ھ کو آں حضرتؐ تقریباً تین سو جاں نثاروں کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔

ایک میل آگے چل کر فوج کا جائزہ لیا۔

جو نوعمر اور کم سن لڑکے جوش جہاد سے چور اور نشۂ شہادت سے مخمور ساتھ چلے آئے تھے، وہ واپس کر دیئے گئے۔

ایک نوعمر مجاہد عمیر بن ابی وقاص کو جب واپس جانے کا حکم ملا تو وہ بے اختیار رو پڑے۔

ان کا یہ جذبہ دیکھ کر آں حضرتؐ نے انہیں بھی اجازت مرحمت فرمائی۔ اور دفعتہً وہ مغموم اور پُرغم چہرہ وفورِ مسرت سے پھول کی طرح کھل گیا۔

بڑے بھائی حضرت سعد بن وقاص نے چھوٹے بھائی کے گلے میں تلوار حمائل کی

اب فوج کا شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اسلام کے دفاع پر کفن سر سے لپیٹ کر جو مجاہد میدان جنگ کی طرف ہر خوف اور خطرہ سے بے نیاز ہو کر بڑھ رہے ہیں۔ ان کی تعداد تین سو تیرہ نفوس سے زیادہ نہیں۔

اِن میں ساٹھ مہاجر اور باقی انصار تھے۔

مسلمانوں نے مدینہ سے آگے چل کر ایک مقام بدر پر پڑاؤ کیا۔

وادی کے دوسرے سرے پر قریش کا لشکر اپنے پورے ساز و سامان اور جاہ و حشم کے ساتھ اترا۔ یہ لشکر ایک ہزار کی جمعیت پر مشتمل تھا نیز سو سواروں کا رسالہ ساتھ تھا۔

قریش کی اس فوج میں کفار مکہ کے تقریباً تمام چوٹی کے سردار اور امرا شریک تھے۔ عباس بن عبد المطلب، عتبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، ابوجہل، اور امیہ۔ یہ وہ لوگ تھے جو باری باری ہر روز دس، دس اونٹ ذبح کرتے اور لوگوں کو کھلاتے تھے۔

عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا بہت بڑا اور معزز رئیس تھا، اس فوج کا سپہ سالار تھا۔

مسلمانوں کے لشکر میں گھوڑے صرف دو تھے۔

جنگ کا ساز و سامان بھی نامکمل تھا۔

رسد اور کمک کا بھی کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔

یہ وہ لوگ تھے جنہیں موت، زندگی سے زیادہ عزیز تھی۔

یہ وہ مجاہد تھے جو اپنی زندگی اور موت کا سودا خدائے واحد و قدوس سے کر چکے تھے اور اس سودے پر نازاں تھے۔

حضرت خباب کے مشورہ کے مطابق مسلمانوں نے آگے بڑھکر ایک چشمہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر فضل خداوندی سے بارش ہوئی جس سے گرد جم گئی۔ اور جا بجا پانی کو روک کر چھوٹے

چھوٹے حوض بنا لیے گئے کہ وضو اور غسل کے کام آئیں۔

یہی چشمہ اگر کفارِ مکّہ کے قبضہ میں ہوتا تو مسلمانوں پر ایک قطرہ آب بھی حرام ہو جاتا لیکن اس پر قبضہ تھا رحمت عالم کا۔ ساقیٔ کوثر کا۔

ارشاد فرمایا۔ اس پانی سے مُسلمان بھی سیراب ہونگے اور کافر بھی۔

ساری رات جنگی تیاریوں کی گہما گہمی میں بسر ہوئی۔

کفار کے خیموں میں رنگ رلیاں جاری رہیں۔ کہیں خاندان اور حسب نسب پر فخر کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ کہیں قتل و غارت کی داستانیں مزے لے لیکر بیان کی جا رہی ہیں۔ کوئی اپنے اشعار آبدار سے دوستوں اور ساتھیوں میں شجاعت اور شہامت کی رُوح بیدار کر رہا تھا۔ کسی کی زبان اپنے مفاخر کیلئے وقف تھی۔ کوئی گروہ مسلمانوں کا خاتمہ کر دینے، ان کا نام و نشان مٹا دینے اور اُنہیں نیست و نابود کر دینے کے منصوبے تیار کر رہا تھا۔ اور کوئی جماعت ہتھیاروں پر صیقل کر رہی تھی۔ کیل کانٹے سے لیس ہو رہی تھی۔

اِسلامی لشکر کے سرفروش اور جاں باز سپاہی عشا کی نماز سے فارغ ہو کر آرام کی نیند سو رہے تھے کہ صبح تازہ دم ہو کر اٹھیں۔ اور میدان کارزار میں اپنی شجاعت اور بہادری کا سکّہ بٹھائیں۔

لیکن ان سب سے الگ ایک ذات نبوی تھی جس کی آنکھیں نیند سے ناآشنا تھیں جسکا جسم اطہر آرام اور راحت سے کوئی واسطہ نہ رکھتا تھا۔

آں حضرتؐ نے ساری رات عبادت اور ریاضت میں گزار دی۔
آپ سجدے کرتے تھے اور بار بار ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر خدا سے فتح و کامرانی اور نصرت کی دُعا مانگتے رہے۔ آپ کو نہ راحت کا خیال تھا، نہ آرام کا فکر تھی تو صرف یہ کہ اسلامی لشکر کو فتح ہو۔
آپؐ نے اپنے رب سے رات کے سناٹے میں جب ساری دُنیا محوِ آسائش تھی خضوع اور خشوع کے عالم میں فرمایا۔ "خدایا! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے آج اُسے پورا کر"۔ پھر محویت اور بیخودی کے عالم میں سجدہ ریز ہوئے۔ اور فرمایا۔ "اے خدا اگر یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پُوجا جائے گا ——!!"
اور آخر خدائے قادر و توانا کا دریائے رحم و کرم جوش میں آیا۔ آں حضرتؐ کی زبان مبارک پر یہ پیشیں گوئی جاری ہوگئی۔ سیھزم الجمع ویولون الدبر یعنی دشمن کی فوج شکست کھائے گی۔ اور کفار پیٹھ پھیر دیں گے۔

صبح ہوتے ہوتے صف آرائی شروع ہوگئی۔
رسولؐ اللہ کے دست مبارک میں ایک تیر تھا۔ اور آپ اس کے اشارے سے مسلمانوں کی صفیں درست فرما رہے تھے۔
آپؐ کی تاکید تھی کہ کوئی شخص تِل بھر بھی آگے پیچھے نہ ہونے پائے۔
دونوں لشکر آمنے سامنے جنگ کیلئے کھڑے تھے کہ اسلام کے لشکر میں صداقت اور وفائے عہد کا ایسا نادر واقعہ پیش آیا جس کی نظیر چشمِ فلک کی نظر سے بھی نہ گزری ہوگی کفار کا لشکر ایک ہزار سے بھی متجاوز تھا۔ اور مسلمانوں کی فوج سوا تین سو بھی نہ تھی جنگ کا

آغاز ہونے ہی والا تھا کہ دو صحابی اُفتاں و خیزاں اسلام کے لشکر میں وارد ہوئے۔ اُنہوں نے کہا ہمیں کفار نے راستہ میں روک لیا تھا۔ اس شرط پر چھوڑا کہ ہم شریک جنگ نہ ہوں۔

یہ سُنتے ہی سرورِ کائناتؐ نے فرمایا "ہم ہر حال میں وعدہ پورا کرینگے ہمیں صرف خدا کی مدد درکار ہے۔ اور پھر وہ دونوں صحابی میدان جنگ سے کنارہ کش ہو گئے اب قریش کی فوجیں بالکل سامنے آ گئیں۔

مُسلمانوں کا لشکر بھی جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔

یہ جنگ دُنیا کی تاریخ میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے انوکھی اور نرالی جنگ تھی۔ نبرد آزما ہونے کے لئے جب دونوں لشکر آمنے سامنے آئے تو معلوم ہوا، ان لڑنے والوں میں باپ کو بیٹے کے خلاف، بھائی کو بھائی کے خلاف، دوست کو دوست کے خلاف، عزیز کو عزیز کے خلاف تلوار اُٹھانی پڑ رہی ہے۔

حضرت ابوبکر جب میان سے تلوار نکال کر میدان جنگ میں اُترے تو جو شخص اُن کے سامنے آیا وہ آپ کا بیٹا تھا۔ جو اب تک مشرف بہ اسلام نہ ہو سکا تھا لیکن حضرت ابوبکر کے وقار اور استقامت میں کوئی فرق نہ آیا۔

لشکر کفار کا سردار عتبہ میدان میں آیا۔ تو اسلام کا جو سرفروش اس کے سامنے پہنچا وہ عتبہ کا لختِ جگر حذیفہ تھا جو مسلمان ہو گیا تھا۔ اور جسے صحابی رسولؐ ہونے کا شرف حاصل تھا۔

حضرت عمر کی تلوار جب فضا میں چمکی تو خود اُن کے ماموں اس کی زد میں تھے۔ خون کے رشتے کٹ رہے تھے۔ نسب اور حسب کے واسطے ٹوٹ رہے تھے صرف

ایک ہی معیار تھا۔ اور وہ تھا حق اور باطل کا۔ کفر اور اسلام کا۔ روشنی اور تاریکی کا ــــ روشنی کو بہر حال آج پھیلنا تھا۔ اور تاریکی کو بہر حال آج روپوش ہونا تھا۔

لشکر کفار کا سردار عتبہ اپنے بھائی اور بیٹے، ولید اور شیبہ کو لیکر جب میدان جنگ میں للکارتا ہوا اور دعوت مبارزت دیتا ہوا اُترا تو چند انصاری اس کے مقابلہ کو آئے۔ اُس نے زور سے چیخ کر کہا "محمدؐ! یہ ہماری ٹکر کے لوگ نہیں۔" آں حضرت کے اشارے سے انصار پلٹ آئے۔ اور حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ میدان میں پہنچے۔

عتبہ زور حمزہ کی تاب نہ لاسکا اور مارا گیا۔

ولید ذوالفقار حیدری کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ ہلاک ہوا۔

شیبہ نے حضرت عبیدہ کو زخمی کیا۔ لیکن حضرت علی نے بڑھ کر تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ وہ بھی اس دُنیا سے ناکام ونامراد رخصت ہوگیا۔

پھر حضرت علی نے حضرت عبیدہ کو کندھے پر رکھا اور رسولؐ اللہ کی خدمت میں تشریف لائے۔ حضرت عبیدہ کا وقت آخر آچکا تھا۔ اُنہوں نے رسولؐ اللہ سے دریافت کیا۔ "کیا میں شہادت کی دولت سے محروم رہا۔؟" سرکار رسالتؐ نے فرمایا: "نہیں ــــ تم نے شہادت پائی!"

پھر عبیدہ نے کہا۔ اگر آج ابوطالب زندہ ہوتے تو تسلیم کرتے، جو اُنہوں نے کہا تھا میں نے کر دکھایا۔

کفار کی یورش اور آں حضرتؐ کے خلاف ان کی شرارتیں دیکھ کر ابوطالب نے

چند شعر کہے تھے۔
ان میں سے ایک شعر میں اُنہوں نے جو کچھ کہا تھا اُس کا مطلب یہ تھا کہ ہم محمدؐ کو اس وقت تک دشمنوں کے حوالے نہیں کر سکتے جبتک اُنکے گرد لڑ کر مر نہ جائیں۔
اور واقعی حضرت عبیدہ نے اپنی جان شیریں خدا کے آخری رسول پر قربان کر دی۔
لشکر کفار سے ایک اور شخص سرتا پا غرقِ آہن، میدان میں آیا۔ اس نے نعرہ لگایا ــــ "میں ابو کرش ہوں ــــ!"
حضرت زبیر اُس کے مقابلہ کے لئے تشریف لائے۔ وہ سر سے پاؤں تک لوہے میں چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ حضرت زبیر نے تاک کر آنکھ میں برچھی ماری۔ وہ زمین پر گرا اور مر گیا۔
انصار رسول اللہؐ کے نام پر جان دیتے تھے۔ انہیں اپنے رسول سے والہانہ محبت تھی۔ وہ جانتے تھے، ابوجہل اسلام، اور داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا کتنا بڑا دشمن ہے۔
چنانچہ دو انصاری بھائیوں، معاذ اور معوز نے عہد کر لیا کہ یہ بدبخت جہاں نظر آئے گا، اسے ہلاک کر کے چھوڑیں گے۔
دونوں بھائی جنگ کے میدان میں ابوجہل کو دیکھ کر شاہین کی طرح جھپٹے۔ اور چشم زدن میں ابوجہل کی لاشں خاک وخون میں تیرنے لگی۔
ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے پیچھے سے آکر معاذ کے بائیں شانے پر تلوار ماری جس سے بازو کٹ گیا۔ لیکن تسمہ باقی لگا رہا۔
معاذ نے عکرمہ کا تعاقب کیا۔

معاذ نے اسی حالت میں جنگ جاری رکھی۔ لیکن محسوس کیا کہ کٹے ہوئے ہاتھ کے لٹکنے سے تلوار چلانے میں دشواری ہوتی ہے، خود ہی اپنے ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر زور سے کھینچا تسمہ الگ ہو گیا۔ ہاتھ کٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اور اسلام کا یہ مجاہد پھر پوری مستعدی کے ساتھ دشمنوں کا قلع قمع کرنے لگا۔

جنگ عالم شباب پر پہنچ گئی۔ تلواریں تیزی کے ساتھ چل رہی تھیں۔ نیزے بے مروتی کے ساتھ اپنا کام کر رہے تھے۔ تیروں کی بارش ہو رہی تھی، لوگ قتل ہو رہے تھے۔ شہادت پا رہے تھے۔ زخمی ہو رہے تھے، ہلاک ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا یہ جنگ فیصلہ کن ثابت ہو گی۔ یہ حق و باطل، کفر اور اسلام، روشنی اور تاریکی کا فیصلہ کر دے گی۔

اور یہی ہوا۔

حق غالب آیا، باطل ناکام ہوا کفر روپوش ہو گیا! اور اسلام کا علم نصرت فضا میں لہرانے لگا۔ روشنی ہر چہار طرف پھیل گئی۔ اور تاریکی کو روپوشی اختیار کرنی پڑی جاءُ الحق و زہق الباطل اِن الباطل کان زھوقا۔

ابو جہل، عتبہ اور دوسرے سرداران قریش کے قتل و ہلاکت کے بعد لشکر قریش نے ہتھیار ڈال دیئے۔

ایک ہزار سے زیادہ مسلح سپاہیوں کا لشکر گراں، تین سو تیرہ نفوس کے لشکر سے شکست کھا گیا، جن کے پاس نہ گھوڑے تھے، نہ جنگ کا ساز و سامان۔

اِس جنگ میں صرف چودہ مُسلمان شہید ہوئے۔
اِن چودہ شہداء میں چھ مہاجر تھے۔
اور آٹھ انصار۔
لیکن کفّار کی قوت پارہ پارہ ہوگئی۔ ان کا تکبّر مٹّی میں مِل گیا۔ ان کی نخوت ذرا بھی کام نہ آئی۔ ان کا ساز وسامان جنگ رائیگاں گیا۔ ان کے لوہے کے خود بھی موت کے فولادی پنجہ سے انہیں نہ بچا سکے۔ ان کی آہنی زرہیں، تلوار کی نوک اور نیزے کی انی کو نہ روک سکیں۔ ان کی تیاریاں ذرا بھی کام نہ آئیں۔ اُنہیں اتنی بڑی شکست ہوئی کہ مکّہ کے گھر گھر سے نوحہ وماتم کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ کوئی عورت ایسی نہ تھی جو سوگوار نہ ہو۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں سے فریاد وفغاں کے نعرے نہ بلند ہو رہے ہوں۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اپنے کسی عزیز، دوست یا ساتھی کے غم میں گریہ کناں نہ ہو۔
رؤسائے قریش، جو اپنی شجاعت اور بہادری میں یکتا تھے، ایک ایک کر کے مارے گئے۔
ان میں شیبہ تھا، جس کے زور وقوت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔
عتبہ تھا، جس کی سیاست، تدبّر اور جنگی مہارت کا ڈنکا بج رہا تھا۔
ابوجہل تھا۔ کفّار قریش جس کی سرداری اور سیادت پر نازاں تھے۔
ابوالبختری تھا۔ جو خاتونانِ عرب کے طعنوں سے بچنے کے لئے رجز پڑھتا ہوا میدانِ جنگ میں اُترا۔ اور بالآخر مارا گیا۔
زمعہ بن اسود تھا، عاص بن ہشام تھا۔ اُمیہ بن خلف تھا۔

یہ سب وہ لوگ تھے، جو قریش کے سرتاج تھے۔ جن پر کفار قریش کو فخر تھا۔ جن کی مرضی اور ایماء بغیر کسی مہم میں ہاتھ نہیں ڈالا جاتا تھا۔ جو ہر معرکہ اور ہر مہم میں پیش پیش رہتے تھے۔

جنگ کے میدان میں قریش کے ستّر آدمی ہلاک ہوئے۔

اور اتنی ہی تعداد اسیران جنگ کی حیثیت سے گرفتار کر لی گئی۔

باقی جس کا جدھر سینگ سمایا بھاگ نکلا۔

قریش کے جو سردار گرفتار ہوئے اُن میں آں حضرتؐ کے چچا عباس، حضرت علی کے بھائی عقیل، آں حضرتؐ کی صاحبزادی حضرت زینب کے شوہر ابو العاص، ام المومنین حضرت سودہ کے عزیز سہیل بن عمر ——————

اسود بن عامر۔

عبد اللہ بن زمعہ

اور بہت سے معزز شرفاء اور سادات مکہ گرفتار ہوئے۔

دنیا نے غزوۂ بدر سے پہلے بھی بہت سی لڑائیاں دیکھی تھیں۔

یہ لڑائیاں عرب کے ریگ زار میں، روم کے میدانوں میں اور ایران کی وادیوں میں ہر جگہ برپا ہوئیں۔

اور ان لڑائیوں کے اختتام پر شکست خوردہ فوج کے سپاہی ہمیشہ گرفتار بھی کیے گئے۔

لیکن اُن اسیران جنگ کے ساتھ کیا برتاؤ ہوتا تھا۔

انہیں ذلیل کیا جاتا تھا، انہیں غلام بنا لیا جاتا تھا۔ اُن سے بے پناہ مشقت لی جاتی تھی۔ جبر اور جور سے کام لیکر ان کا مذہب تبدیل کرایا جاتا تھا۔ اور اکثر اوقات ہتھیار ڈال دینے اور گرفتار ہو جانے کے باوجود انہیں قتل بھی کر دیا جاتا تھا۔ لیکن رحمتہ للعالمین نے ان قیدیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔؟

اسیرانِ جنگ دو، دو اور چار، چار کی ٹکڑیوں میں صحابہ کرام کے مابین تقسیم کر دیئے گئے۔

رسول اللہؐ نے تاکید کے ساتھ ارشاد فرمایا۔ یہ آرام سے رکھے جائیں۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے۔ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔ ان کی دل شکنی نہ کی جائے۔ ان کی توہین نہ کی جائے۔ انہیں ذلیل نہ کیا جائے۔

اِسلام کے پرستار اور محمدؐ کے فدائی اپنے رسولؐ کے ایک ایک لفظ کو دل کے کانوں سے سُنتے تھے اور پوری صداقت اور دیانت کے ساتھ ان پر عمل کرتے تھے۔

رسول اللہؐ کے اِس ارشاد کے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اسیرانِ جنگ جو اسلام اور داعی اسلام کے بدترین دشمن تھے، جن کی زندگی کا مقصد صرف یہ تھا کہ اسلام کی دعوت کو مقبول نہ ہونے دیں، جن کی آرزوؤں اور تمناؤں کا حاصل صرف یہ تھا کہ داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آوازۂ حق کو دبا دیں آج وہ مُسلمانوں کے معزز مہمان تھے۔

اب صحابہ کی یہ کیفیت تھی کہ انہیں اچھے سے اچھا کھلاتے تھے اور خود کھجوریں کھا کر گزر اوقات کرتے تھے۔

ان قیدیوں میں ابوعزیر بھی تھے۔
یہ حضرت مصعب بن عُمیر کے بھائی تھے۔
یہ بیان کرتے ہیں کہ جن انصاری نے مجھے اپنے گھر میں قید کیا تھا، جب کھانا لاتے، تو روٹیاں میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اُٹھا لیتے۔ ان کی یہ خاکساری اپنی پیربندی دیکھ کر مجھے شرم آنے لگتی۔ میں روٹی اُن کے ہاتھ میں دے دیتا۔ لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے۔ مجھے اصرار کے ساتھ واپس کر دیتے۔ انصاریوں کا یہ سلوک میرے ساتھ اس لئے تھا کہ رسول اللہؐ نے تاکید فرمائی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔
انہی قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمر بھی تھا۔
سہیل بہت بڑا خطیب تھا۔ اس کی خطابت کا جوہر دوست دشمن سب سے اپنی داد لیتا تھا۔
وہ فصیح و بلیغ بھی تھا۔ اس کے مُنہ سے جو الفاظ نکلتے وہ اپنا اثر کئے بغیر نہ رہتے۔
اور یہ سہیل آں حضرتؐ کا بدترین دشمن تھا۔
اس کی خطابت کا جوہر صرف ذاتِ رسالت پناہ کے خلاف استعمال ہوتا تھا۔
اس کی فصاحت و بلاغت، اس کی طاقتِ لسانی، اُس کی زبان دانی اور زبان آرائی، اس کا حُسن بیان۔ اس کا زورِ کلام، غرض اس کا سارا کمالِ فن صرف اِس لئے تھا کہ وہ اسلام کے خلاف استعمال ہو۔ داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لب کشائی اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بن چکا تھا۔

وہ اپنی تقریروں اور خطبوں میں رسول اللہؐ کے خلاف لب و لہجہ کی پوری شدّت، انداز بیان کی پوری قوت صرف کر دیتا تھا۔

آج وہ گرفتار ہو چکا تھا۔

اب وہ مسلمانوں کا قیدی تھا۔

اب اس کی زندگی صرف مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔

حضرت عمر نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہؐ! یہ سہیل بن عمر موجود ہے۔ اس کے نیچے کے دو دانت اکھڑوا دیجئے۔ تاکہ پھر یہ اپنی خطابت اور فصاحت و بلاغت سے اسلام اور رسولِ خدا کے خلاف کام نہ لے سکے۔

لیکن

رسول اللہؐ نے حضرت عمر کا یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

آپ نے فرمایا اگر میں اس کی صورت بگاڑوں گا تو گو میں نبی ہوں لیکن خدا مجھے بھی نہ معاف کرے گا۔ اور میری صورت بھی بگاڑ دے گا۔

صلوٰت۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ

آج سے چودہ سو برس پہلے جنگ کے اسیر صرف ایک ہی سلوک کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔

قتل ——!

لیکن ، اسلام کا راستہ سلامت روی ، عدل ، انصاف ، مساوات ، رحم اور فلاح انسانیت کا راستہ تھا۔

اس معاملہ میں بھی اُس نے دُنیا کی رہنمائی کی۔

اور ایک شاندار مثال قائم کردی۔

مدینہ میں تشریف لانے کے بعد آں حضرتؐ نے صحابہ کرام کو بہ غرض مشورہ طلب فرمایا۔

دریافت فرمایا کہ اسیران جنگ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟

حضرت ابوبکر نے عرض کی، فدیہ لیکر اسیران جنگ کو رہا کردیا جائے۔

حضرت عمر نے یہ رائے پیش کی کہ تمام اسیران جنگ قتل کردیئے جائیں۔

اور ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو خود قتل کرے۔

رسول اللہؐ نے یہ دونوں رائیں سُنیں۔

اور غور و فکر کے بعد حضرت ابوبکر کی رائے سے اتفاق فرمایا۔

ارشاد ہوا ـــــ فدیہ لے کر اسیران جنگ رہا کردیئے جائیں۔

لیکن ان قیدیوں میں جہاں دولت مند اور ارباب ثروت تھے۔ وہاں ایسے لوگ بھی تھے، جو نادار تھے، جن کی جیب خالی تھی۔ جو اپنی رہائی کا کوئی معاوضہ نہیں پیش کرسکتے تھے۔

ایسے قیدیوں میں سے جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

اُن کا فدیہ یہ رکھا گیا کہ دس دس مسلمان بچّوں کو لکھنا سکھادیں۔

کاتب وحی حضرت زید بن ثابت نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔

ان قیدیوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو نادار بھی تھے۔ اور دولت علم سے بھی محروم تھے۔

رحمتہ للعالمین نے انہیں بغیر کسی فدیہ اور معاوضہ کے رہائی مرحمت فرمادی۔

اور انہی قیدیوں میں عباس بھی تھے۔

آں حضرت کے چچا۔

آں حضرت کی ذاتِ گرامی سے محبت کرنے والے۔

عباس نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، لیکن اسلام کے داعی اور پیامبر سے انہیں جو محبت تھی اس کا اندازہ بیعت عقبہ کے واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ اس موقعہ پر جب مدینہ کے ۷۲ انصار نے مکہ میں اپنے بت پرست ساتھیوں سے چھپ کر اسلام قبول کیا تھا۔

اور یہ چاہا تھا کہ آں حضرتؐ مدینہ میں تشریف لے آئیں۔

تو رسول اللہؐ کے ساتھ اسلام نہ قبول کرنے کے باوجود عباس بھی تھے۔

عباس نے انصار سے خطاب کر کے کہا "گروہ خزرج! محمد اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں۔ دشمنوں کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کے لئے سینہ سپر رہے۔ اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں، اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر، ورنہ ابھی سے جواب دے دو۔"

خود رسول اللہؐ کو بھی عباس سے دلی تعلق خاطر تھا۔

یہ عباس جب گرفتار ہو کر مدینہ آئے تو ان کا قید خانہ آں حضرت کے حجرہ کے قریب تھا۔ عباس کے کراہنے کی آواز جب سمع مبارک تک پہنچی تو آپ بیکل ہو گئے۔ رات بھر آپ کو نیند نہ آئی۔ جب ان کی گرہ کھول دی گئی، تب آپ نے آرام فرمایا۔

انصار جانتے تھے عباس کون ہیں؟ رسول اللہؐ کو ان سے کتنی محبت ہے۔ انہوں نے جب فدیہ کا سوال اٹھایا تو کہا "ہم عباس کا فدیہ چھوڑے دیتے ہیں۔"

لیکن رسول اللہؐ نے انصار کی یہ پیش کش قبول نہیں فرمائی۔

اس لئے کہ یہ پیش کش انصاف اور مساوات کے خلاف تھی۔

یہ ہو سکتا تھا کہ کسی سے فدیہ نہ لیا جائے۔

مگر رسالت مآب یہ گوارا نہیں فرما سکتے تھے کہ کسی سے فدیہ لیا جائے اور کسی سے نہ لیا جائے۔

چنانچہ حضرت عباس نے بھی جو مکہ کے چند خاص دولت مندوں میں شمار ہوتے تھے، فدیہ ادا کیا تب رہائی حاصل کی۔

حضرت عباس کے ساتھ آں حضرت کے تعلق خاطر اور طبیعت کی دوسری مثال یہ ہے کہ گرفتاری کے بعد انہیں پیراہن کی ضرورت ہوئی، لیکن ان کا قد اتنا اونچا تھا کہ کسی کا کرتہ ان کے بدن پہ ٹھیک نہیں اترتا تھا، عبداللہ ابن اُبی نے اپنا کرتہ منگوا کر دیا جو پورا اترا۔ اور حضرت عباس نے اُسے پہن لیا۔

یہ عبداللہ ابن اُبی، دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا۔ منافق تھا۔ بہت بڑا منافق اسی لئے اس کا خطاب رئیس المنافقین پڑ گیا۔

صحیح بخاری میں اس کی تصریح ہے کہ عبداللہ کے مرنے کے بعد آں حضرتؐ نے اس کے کفن کے لئے اپنا پیراہن مبارک جو عطا فرمایا تھا وہ اسی احسان کا معاوضہ تھا۔

حضرت عباس کے ساتھ ایک منافق نے جو احسان کیا تھا اسے آں حضرت نے یوں محسوس فرمایا کہ گویا یہ احسان خود آپ کی ذات گرامی پر تھا۔

لیکن حضرت عباس اس غیر معمولی محبت اور تعلق خاطر کے باوجود جو فدیہ لیا گیا وہ عام قیدیوں کے فدیہ سے زیادہ تھا۔

اس لئے کہ امراء اور دولتمندوں کے لئے فدیہ کی جو تعداد معین کی گئی تھی وہ زیادہ تھی حضرت عباس چونکہ دولتمند تھے لہذا انہیں بھی زیادہ رقم دینا پڑی۔

رسول اللہؐ کی ذاتی محبت اور حضرت عباس کے ذاتی خصائص اس اسلامی مساوات کو مجروح نہ کر سکے جو عام و خاص کے تفرقے سے بے نیاز تھی۔

بدر کی یہی وہ کامیابی تھی جس کا ذکر سورہ آل عمران میں خدا نے یوں فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔

بلاشبہ خدا نے جنگ بدر میں تمہاری مدد کی۔ جب تم کمزور تھے۔ خدا سے ڈرتے رہو، تاکہ تم شکر گذار بندے بن جاؤ۔

مُلتان کی فتح

ریگ زارِ عرب کے باشندے جب اسلام کا پیام لیکر اپنے دیس سے باہر نکلے تو دنیا نے حیرت اور تعجب کے ساتھ اس حقیقت کو محسوس کیا کہ یہ وہ قوت ہے، جو

سنگِ خارا کو بنا دیتی ہے اک مُشتِ غبار

اس کی زد کھا کے لرز جاتی ہے بنیادِ زمیں
اس سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں اوراقِ دیار
یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچّے
کھیلنے جاتے تھے ایواں گہِ کسریٰ میں شکار
وہ اُلٹ دیتے تھے دُنیا کا مُرقّع دم میں
جن کے ہاتھوں میں رہا کرتی تھی اونٹوں کی مہار
اُس کی برکت تھی کہ صحرائے حجازی کی سموم
بن گئی دہر میں جا کر چمن آرائے بہار

یہ اُسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن
فاش کرنے لگے جبریلِ امیں کے اسرار

عربوں کا قافلہ فتح و ظفر اسلام کا پرچم ہاتھ میں لیکر تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اس کا بڑھا ہوا قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ وہ جس طرف رُخ کرتا، کامیابی اُس کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔

یہ پہلی صدی ہجری کا آخری زمانہ تھا۔ اموی حکومت کے جاہ و جلال کی دنیا میں دُھوم مچی ہوئی ہے، فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔
اس زمانے میں حجاج بن یوسف ثقفی نے مُسلمان خواتین کی بے حرمتی سے متاثر ہو کر محمد بن قاسم کی سرکردگی میں ایک لشکرِ گراں سندھ کی فتح پر مامور کیا۔
محمد بن قاسم سندھ میں داخل ہوا۔ جس قلعہ پر پہنچا وہ سرنگوں ہو گیا۔ جس شہر کا رُخ کیا اُسنے اماں طلب کر کے اپنے پھاٹک کھول دیئے۔
سندھ کا بہت بڑا حصّہ اب اسلامی پرچم کے زیرِ تحت امن اور عافیت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اور اسلامی لشکر کشور کشائی کے لئے سیلِ رواں کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔
سندھ کا راجہ داہر مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل ہوا۔ اور محمد بن قاسم مفتوحہ مقامات میں نظم و امن قائم کر کے دریائے چناب سے پار اُترا۔ اور سندھ کے سب سے بڑی جنگی مرکز ملتان کے سامنے اپنی فوجیں لا کر کھڑی

کر دیں اور محاصرہ کر لیا۔

ملتان کی حکومت اُس وقت راجہ گورسنگھ کے ہاتھ میں تھی۔

یہ راجہ داہر کا بھتیجا یعنی اس کے بھائی چندر کا لڑکا تھا۔

گورسنگھ نے مسلمانوں کا لشکر دیکھا اور لڑنے کے لئے تیار ہو گیا

اُسے اپنے ذرائع و وسائل پر ناز تھا۔ اپنی موج در موج فوج پر بھروسہ تھا۔ اپنے ضرورت سے زیادہ سامان جنگ پر اعتماد تھا۔ اُسے یقین تھا، وہ محمد بن قاسم کے لشکر کو تباہ کر دے گا۔ اور ان تمام مقامات کو جیت لے گا جو اسلامی حکومت کے زیر نگیں آ چکے تھے۔

(طبل جنگ، قرنا اور طبل کی آوازیں، گھوڑوں اور اونٹوں کی آوازیں، ہتھیاروں کی جھنکار، پیادوں کے چلنے اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی ملی جلی آوازیں)

عربوں کے محاصرہ سے تنگ آ کر ملتانی فوج میدان میں یہ فیصلہ کر کے اُتری ہے کہ آج وہ میدان جیت کر رہے گی۔ عرب سپاہی بھی کیل کانٹے سے لیس تیار کھڑے ہیں کہ سپہ سالار حکم دے اور وہ آگے بڑھیں۔ ملتانی فوج کی کمان سکہ کے والی کے ہاتھ میں ہے۔ جو مسلمانوں کو سکہ فتح کرنے سے نہ روک سکا تھا۔ اور ملتان میں آ کر پناہ گزین ہو گیا تھا، وہ بڑے جوش و خروش سے اپنے نوجوانوں کو اُبھار رہا ہے۔

ملتانی کمانڈر:۔ دوستو! ہمیں دشمن کی سرکوبی کے لئے اُس تک جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ خود مرنے کے لئے ہمارے دروازے پر آیا ہے۔ سکہ فتح کر کے وہ یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ ملتان بھی فتح کر لے گا۔ تم اسے بتا دو کہ

ملتان کے جیالے اور سورما، عرب سپاہیوں کو اپنی تلواروں کی لوری سے موت کی نیند سُلا سکتے ہیں۔ یاد رکھو اگر ملتان فتح ہو گیا تو اسلامی لشکر بے روک ٹوک آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ پھر ہم اسے کہیں بھی نہ روک سکیں گے۔
بہادرو آگے بڑھو! شاباش! دیکھو وہ دشمن بھی آگے بڑھ رہا ہے۔

محمد بن قاسمؒ: مسلمانو! تم خدا کے لئے کفن سر سے باندھ کر میدان میں اُترے ہو۔ تمہاری زندگی اور موت صرف خدا ہی کے لئے ہے۔ یہ زندگی تمہاری نہیں خدا کی امانت ہے۔ اس امانت کا حق ادا کرو۔ اور وہ حق یہ ہے کہ کمزوروں کی مدد کرو۔ ظالموں کا سر کچل دو۔ سندھ کے بدھ عوام، ہندو برہمنیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ اس دیس کی اصل آبادی ہیں۔ وہ اناج پیدا کرتے ہیں۔ دولت پیدا کرتے ہیں۔ لیکن جو کچھ پیدا کرتے ہیں ان سے چھین لیا جاتا ہے۔ ان کے نصیب میں صرف فاقہ آتا ہے۔ وہ آسمان کی طرف حسرت بھری نظروں سے مدد کے لئے دیکھتے ہیں۔ ہم ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ اُنہیں آزادی دینا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح خدا کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لشکر جو تمہارے سامنے کھڑا ہے، اتنا ہی بے حقیقت ہے جتنا سکہ کا تھا۔ اور اس لشکر کا کمانڈر وہی بہادر ہے، جو تاب مقابلہ نہ لا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اسے صرف اپنے ساز و سامان اور فوج کی کثیر تعداد پہ ناز ہے۔ اور ہمیں خدائے ذوالجلال کے وعدہ فتح و نصرت پر اعتماد ہے ـــــ ہاں وہ دیکھو! دشمن قریب پہنچ گیا۔ دلیری اور دلاوری کے ساتھ اس کا استقبال کرو۔

(جنگ کی کیفیت، زخمیوں کی کراہیں)
اور بالآخر ملتان فتح ہوگیا۔ گورنگھ کشمیر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

(محمد بن قاسم کا خیمہ، فوجیوں کے اظہار مسرّت کی کیفیت، آپس میں باتیں کر رہے ہیں)

ایک سپاہی:۔ بہت بڑا مرحلہ طے ہوگیا۔

دوسرا سپاہی:۔ ملتان کے راجہ نے مقابلہ میں کوئی کمی نہ کی۔ لیکن قسمت سے لڑنا اس کے بس میں نہ تھا، ہار گیا۔

تیسرا سپاہی:۔ ہارا اور بُری طرح ہارا۔

چوتھا سپاہی:۔ سُنا ہے اب وہ کشمیر گیا ہے تاکہ وہاں سے کمک لائے اور ہمیں شکست دے۔

پہلا:۔ جانے دو، کشمیر کے راجہ کا دم خم بھی دیکھ لیں گے۔

تیسرا:۔ ہم تو سر سے کفن باندھ کر گھر سے نکلے ہیں۔ یا فتح یا موت!

پانچواں:۔ مرے تو شہید، جئے تو غازی۔

محمد بن قاسم:۔ یہ کیسی آوازیں ہیں؟

ایک سردار:۔ یا امیر! فوجیوں نے دشمن کی بہت بڑی فوج کو شکست فاش دے کر اب کمر کھولی ہے۔ ذرا ہنس بول رہے ہیں۔

محمد بن قاسم:۔ ہوں ـــــ بہت خوش ہیں ہمارے سپاہی؟

سردار :- یا امیر! بہت خوش جان کی بازی لگادی تھی انہوں نے۔ وہ شہید ہونے کے لئے میدان میں اُترے تھے۔ خدا نے ان میں سے کچھ کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا، اور ——

محمد بن قاسم :- اور باقی لوگوں کو غازی بننے کا موقعہ مرحمت فرمایا؟ کیوں یہی کہہ رہے تھے نا؟

سردار :- یا امیر! یہی بات ہے —— اگر گستاخی نہ ہو تو ایک بات عرض کروں۔

محمد بن قاسم :- کہو — ہم سُنیں گے۔

سردار :- میں دیکھتا ہوں۔ آج ہمارے لشکر کا ہر ہر فرد خوشی سے بیتاب ہو رہا ہے۔ مگر ——

محمد بن قاسم :- ہاں، آگے؟ —— کیا کہنا چاہتے ہو تم؟

سردار :- مگر ہمارے امیر کے چہرے پر فکر و اضطراب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی بہت بڑی فکر ہے، جو انہیں پریشان کئے ہوئے ہے۔

محمد بن قاسم :- تمہارا اندازہ صحیح ہے۔ واقعی میں بہت فکر مند ہوں۔ اتنا زیادہ کہ اِس خوشی میں پورا حصّہ نہیں لے سکتا۔

(قدموں کی آہٹ)

چوبدار :- یا امیر ایک شخص حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔

محمد بن قاسم :- کون ہے وہ؟

چوبدار :- صورت سے کوئی برہمن معلوم ہوتا ہے۔

محمد بن قاسم :- اسے ہمارے سامنے پیش کرو۔

(قدموں کی آہٹ)

محمد بن قاسم :۔ اے شخص تو کون ہے؟ اور کیا چاہتا ہے؟

برہمن :۔ میں آپ کے سامنے ہتھیار ڈالنے حاضر ہوا ہوں۔

محمد بن قاسم :۔ ہتھیار ڈالنے؟ ـــــ لیکن تم تو نہتے ہو؟

برہمن :۔ نیت کا کھوٹ، دشمنی، نفرت، حسد، عداوت ـــــ یہ سب چیزیں بھی ہتھیار کی طرح کام میں لائی جاتی ہیں۔

محمد بن قاسم :۔ ٹھیک ہے، تو آج سے تم خلوص اور سچائی کے ساتھ پیمانِ وفا باندھنے آئے ہو؟

برہمن :۔ ہاں، آپ نے سچ سمجھا۔

محمد بن قاسم :۔ اب تمہاری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں؟

برہمن :۔ نہیں۔

محمد بن قاسم :۔ تمہارے دل میں ہمارے خلاف نفرت، دشمنی اور حسد کا کوئی جذبہ نہیں؟

برہمن :۔ بالکل نہیں۔

محمد بن قاسم :۔ لیکن یہ انقلاب دفعتہً کیوں ہوگیا۔ تمہاری دشمنی دوستی سے کیسے بدل گئی؟

برہمن :۔ میں نے بادشاہوں کو دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان کا لشکر فتح کا پھریرا اُڑاتا ہوا جب کسی شہر میں داخل ہوتا ہے تو ہم مذہب ہونے کے باوجود نہ عورتوں کی آبرو محفوظ رہتی ہے، نہ دولتمندوں کا روپیہ۔ میں نے سپاہ لاروں کو دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان کے سپاہی فتح کے نشہ میں جھومتے

ہوئے جب داخل ہوتے ہیں تو نہ وہ خطا کار کو چھوڑتے ہیں، نہ بے گناہ کو، وہ کھیت لوٹ لیتے ہیں۔ مکان ڈھا دیتے ہیں۔ دُکانوں کا تالا توڑ کر نقد و جنس پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ جو اُن کے سامنے آتا ہے بغیر پوچھ گچھ کے اس کی گردن اُڑا دیتے ہیں۔ کوئی ظلم ایسا نہیں ہوتا جو وہ نہ کرتے ہوں۔ کوئی زیادتی ایسی نہیں ہوتی جسے ان کے سپاہی روا نہ رکھتے ہوں۔ لیکن ــــ لیکن میں نے دیکھا، آپ کی فوجیں اس شہر میں داخل ہوئیں اُنہوں نے اس شہر کو فتح کر لیا۔ حکومت بدل گئی۔ لیکن یہ سب اس طرح ہوا کہ ہمیں احساس بھی نہ ہونے پایا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ بازار کھُلے ہیں اور کاروبار ہو رہا ہے۔ مندروں کے گھنٹے بج رہے ہیں اور پُوجا پاٹ کا سلسلہ جاری ہے، نہ کسی کی جائداد ضبط ہوئی، نہ کسی کا سامان لوٹا گیا۔ نہ کسی پر ظلم کیا گیا۔ نہ کسی نے مظلوم کی حیثیت سے فریاد کی۔ ایسا سپہ سالار انسان نہیں اوتار ہے۔ ہم اُس کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتے۔ اس کے خلاف سازش نہیں کر سکتے۔ اس کے خلاف کوئی بُرا خیال اپنے دل میں نہیں لا سکتے۔ ہمارا زوال ہمارے اعمال بد کا نتیجہ ہے۔ آپ کی کامیابی اور فیروزمندی آپ کے نیک عمل کا نتیجہ ہے۔ آپ سے لڑنا خدا سے لڑنا ہے۔ کیونکہ خدا آپ کی مدد کر رہا ہے۔ اسی لئے میں سچّے دل سے اطاعت اور وفاداری کا عہد کرتا ہوں۔

محمد بن قاسم:۔ ہم تمہارے الفاظ کو سچ سمجھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے تم جو کچھ کہہ رہے ہو۔ دل سے کہہ رہے ہو۔

برہمن :۔ بیشک میں جو کچھ کہہ رہا ہوں دل سے کہہ رہا ہوں، اور اپنی سچائی کا ثبوت بھی اپنے پاس رکھتا ہوں۔

محمد بن قاسم :۔ ثبوت ـــــ ؟ ثبوت کی کیا ضرورت ہے۔

برہمن :۔ وہ ثبوت بھی ہے، اور خدمت بھی، میں چاہتا ہوں مجھے خدمت کا موقعہ دیا جائے۔

محمد بن قاسم :۔ ہم ثبوت کی ضرورت نہیں سمجھتے لیکن تمہیں خدمت سے بھی روکنا مناسب نہیں سمجھتے ـــــ ہاں تو تم کون سی خدمت سرانجام دینا چاہتے ہو ؟

برہمن :۔ اگر آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں تو میرے ساتھ تشریف لائیے !

محمد بن قاسم :۔ چلو !

ایک سردار :۔ یا امیر تنہا ـــــ ؟ آپ تنہا تشریف لے جائیں گے۔

محمد بن قاسم :۔ ہاں ـــــ تلوار میرے ہاتھ سے کبھی جدا نہیں ہوتی، میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں۔ لیکن موت کو نہیں ٹال سکتا۔ وہ جب آنا چاہے گی تو آ کر رہے گی۔

برہمن :۔ یا امیر! آپ کے اس اعتماد کا میں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، لیکن دو چار سردار اگر ساتھ چلیں تو کوئی حرج نہیں۔ اچھا ہی ہے۔

(قدموں کی آواز)

برہمن :۔ یا امیر! وہ جگہ آ گئی۔

محمد بن قاسم :۔ لیکن یہاں تو تاریکی کے سوا کچھ نہیں۔

برہمن :۔ اور آگے بڑھئے ۔

(قدموں کی آواز)

محمد بن قاسم :۔ یہ سامنے کون دیو ہیکل آدمی کھڑا ہے ؟

برہمن :۔ (ہنس کر) یا امیر یہ آدمی نہیں، سونے کا ٹھوس "ملتان" ہے۔ شہر کا نام اسی بُت کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اور اس بُت کے نیچے بہت خزانہ ہے حکم دیجئے کہ اسے کھودا جائے ۔

محمد بن قاسم :۔ خزانہ کھودا گیا ؟

سردار :۔ کھود لیا گیا ۔

محمد بن قاسم :۔ کیا برآمد ہوا ؟

سردار :۔ دو سو تیس من خالص سونا، اور تیرہ ہزار دو سو من خاکِ طلا۔ یہ ساری چیزیں تانبے کے مٹکوں میں اُسی طرح رکھی ہیں جس طرح برآمد ہوئی ہیں ۔

محمد بن قاسم :۔ خدا کا شکر ہے ـــــ تمہیں یاد ہے تم نے فتح ملتان کے دن مجھ سے سوال کیا تھا۔ میں پریشان اور متفکر کیوں ہوں ؟

سردار :۔ یاد ہے یا امیر ـــــ !

محمد بن قاسم :۔ سندھ پر حملہ کے مصارف کا تخمینہ تین کروڑ آ رہا تھا۔ حجاج نے خلیفہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ یہ رقم مالِ غنیمت کی صورت میں ادا کر دے گا۔ اور میں نے حجاج سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس سے دوگنی رقم پیش کروں گا۔ لیکن سندھ فتح ہو گیا۔ داہر قتل ہو گیا۔ ہماری فتوحات کا سلسلہ وسیع سے

وسیع تر ہوتا گیا۔ پھر بھی میں حجاج کو یا خلیفہ کو کچھ نہ بھیج سکا۔ جبر و جور کے ذریعہ آسانی سے پچاس کروڑ وصول کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے فتح کرتے وقت رعایا سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی جان و مال محفوظ رہے گی پھر میں اُس کے مال پر ہاتھ کیسے ڈالتا؟ جس رعایا کی جان و مال کا میں امین تھا، میرا ضمیر ہرگز اس پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میں اسے لوٹ لوں ــــ یہ تھی وہ فکر جس نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ اور الحمد للہ کہ وہ فکر آج دُور ہو گئی

(قدموں کی آواز)

یا امیر ــــ امیر حجاج بن یوسف کا نامہ بر آیا ہے۔

محمد بن قاسم :۔ نامہ بر کو بُلاؤ۔

(قدموں کی آہٹ)

نامہ بر :۔ امیر حجاج آپ کی فتح و نصرت کے دُعا گو ہیں۔ اُنہوں نے آپ کی خیریت مزاج دریافت کی ہے۔ اور یہ نامہ دیا ہے۔

محمد بن قاسم :۔ لاؤ۔

محمد بن قاسم :۔ امیر نے مجھے میرا وعدہ یاد دلایا ہے ــــ تم کل ہی واپس جاؤ اور امیر کی خدمت میں میرا نامہ اور یہ مال غنیمت پیش کر دو۔

نامہ بر :۔ بہت خوب۔

حجاج :۔ تم محمد بن قاسم کے پاس سے آ رہے ہو؟
نامہ بر:۔ یا امیر وہیں سے آ رہا ہوں۔ اور یہ نامہ لایا ہوں۔
حجاج :۔ لاؤ۔

حجاج :۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ — اب میرا دل ٹھنڈا ہوا۔ اب میرے سر سے ایفائے وعدہ کا بوجھ اُترا۔ اب میں خوش ہوں۔ بہت خوش تین کروڑ کے بجائے بارہ کروڑ درہم مالِ غنیمت کی صورت میں میرے سامنے ہیں۔ اب میں امیر المؤمنین کے سامنے سُرخ رُو ہوا۔ اتنی بڑی رقم اور داہر کا سر — یہ محمد بن قاسم کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ خدا کی نصرت اُس کے ساتھ ہے۔ محمد بن قاسم سے میں بہت خوش ہوں۔ اُس نے ہندوؤں کی دل آزاری کے خیال سے بُت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ صرف خزانہ پر قبضہ کیا۔ یہ بھی بہت اچھا کیا۔

اور پھر دو سال کے بعد یعنی ۲۹۰ھ میں ابن رستہ نے جب اپنی کتاب لکھی تب بھی یہ بُت موجود تھا۔ اس عرصہ میں بڑا انقلاب ہو چکا تھا۔
اب امویوں کے بجائے عبّاسی تخت خلافت پر متمکن تھے۔
اور ملتان پر ایک قریشی خاندان برسرِ حکومت تھا۔
جو عبّاسی خلیفہ المعتز باللہ کے نام کا خطبہ پڑھا کرتا تھا۔
ابن رستہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ہندو پوری آزادی سے اِس

بُت کی پُوجا کرتے ہیں۔ دو ہزار سال قبل ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق یہ بُت آسمان سے اُترا تھا۔ اس بُت پر بڑے قیمتی چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ اس مندر کے پُجاریوں اور دیوداسیوں کا خرچ اس کی آمدنی سے پُورا ہوتا ہے۔ جب کوئی مالدار آدمی مرنے لگتا ہے تو اپنا نصف یا تمام مال اس بُت کے نام وصیت کر جاتا ہے۔ اس کی زیارت کے لئے سال سال بھر کی مسافت طے کر کے ہندو آتے ہیں۔ اور سر مُنڈا کر اس کا طواف کرتے ہیں۔ اس بُت کے چار مُنہ ہیں۔ تعظیم کے خیال سے اس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ بُت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کا چڑھاوا بھی خودکشی کی صورت میں نذر کر دیتے ہیں۔ بہت سی لڑکیاں صرف اس بُت کی خدمت پر مامور ہیں۔ وہ اسے گھی اور دُودھ سے غُسل دیتی ہیں۔ اسے خوش کرنے کے لئے اُس کے سامنے رقص کرتی ہیں۔ پُجاری کیلے کا ایک بڑا پتّہ لے کر اُسے پنکھا جھلتا ہے۔

جب تک عربوں کی اس شہر پر حکومت رہی، اگرچہ حالات بدلتے رہے انقلابات آتے رہے، بادشاہتوں میں تبدیلی ہوتی رہی۔ لیکن ملتان نے عروج و رفعت کی طرف جو قدم اُٹھایا تھا وہ برابر آگے بڑھتا رہا۔

ایک مورخ اپنے عینی مشاہدات کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ ملتان کے گرد و نواح بالا فصیلیں ہیں۔ یہ بڑا زرخیز ملک ہے۔ اس کو "بیت الذہب" بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ فتح کے وقت یہاں سے سونے کی بہت بڑی تعداد مسلمانوں کے ہاتھ آئی تھی۔ ملتان کی چھاؤنی جُندر کے نام سے مشہور ہے۔

امیرِ ملتان کی قیام گاہ بھی یہیں ہے۔ وہ جُمعہ کی نماز پڑھنے ہاتھی پر سوار ہو کر ملتان جاتا ہے۔ وہ بالکل خود مختار ہے۔ مگر جمعہ کے خطبہ میں عبّاسی خلیفہ کا نام پڑھتا ہے۔ یہ قریشی امیر سامہ بن لوی کے خاندان سے ہے۔

ملتان کی حکومت بڑی اور وسیع تھی۔ اس کا مستقل نظام حکومت تھا۔ فوجی چھاؤنیاں قائم تھیں۔ سرکاری دفاتر، شفاخانے، عدالت، رسد خانہ اصطبل، قضا وغیرہ کے الگ الگ شعبے تھے، چراہوں کے لئے وسیع میدان چھوڑے جاتے تھے۔ گھوڑوں کی افزائش نسل کا سرکاری طور پر انتظام تھا۔ سرکاری محاصل شریعت کے مطابق وصول ہوتے تھے مسلمانوں سے صدقہ اور زکوٰۃ، غیر مسلموں سے جزیہ کے سوا کوئی رقم نہ لی جاتی تھی۔ جزیہ کی رقم جان و مال کی حفاظت کے صلہ میں لی جاتی تھی۔ اگر مسلمانوں کو کسی شہر سے ہٹنا پڑتا تو اُس سال کی جزیہ کی وصول شدہ رقم واپس کر دیتے تھے، جزیہ کی رقم تونگروں سے دس روپیہ، اوسط طبقہ سے پانچ روپے، اور کم آمدنی والوں سے ڈھائی روپیہ سال لی جاتی تھی۔ نیز عورتوں، بوڑھوں، بچّوں، اپاہجوں، بیکاروں اور معذوروں سے بالکل جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ مُسلمانوں کے فیصلے محکمہ قضا کرتا تھا۔ اور ہندوؤں کو اپنے شاستر کے مُطابق فیصلے کرنے اور قوانین وضع کرنے کا اختیار تھا۔ اُنہیں مکمل شہری اور شخصی آزادی حاصل تھی، ان کے مندروں کا اور رُتبوں کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

محمد بن قاسم نے جب یہ علاقہ فتح کیا تھا تو یہاں کے لوگ غیر متمدّن زندگی بسر کرتے تھے۔ اسی لئے یہاں کا راجہ معمولی سے معمولی جرائم پر زن و بچّہ کو آگ میں جلوا دیتا تھا۔ مگر دو تین صدی کے اسلامی تسلّط کے بعد سندھ اور ملتان کی حالت بہت بدل گئی۔ ۳۶۷ھ میں ابن حوقل نے ملتان کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے۔ "یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کا لباس یکساں ہے۔ کرتے بھی پہنے جاتے ہیں، تاجر قمیص اور چادر استعمال کرتے ہیں۔ عربی اور سندھی زبان کا عام رواج ہے۔ ۳۷۵ھ میں بشاری نے یہاں کا سفر کیا۔ وہ ملتان کے بارے میں لکھتا ہے۔ "یہاں کئی کئی منزل کے مکانات ہیں۔ یہاں بدکاری اور شراب خوری کا چرچا بالکل نہیں، ہر طرف سرسبزی اور شادابی نظر آتی ہے۔ دولت کی افراط ہے۔ بیوپار کی حالت بھی بہت اچھی ہے۔ عام لوگوں کی زندگی تکلّف اور تنعّم کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ حکومت کا شعار عدل و انصاف ہے۔ بازار میں کوئی عورت بناؤ سنگھار کر کے گھومتی نہیں نظر آئے گی۔ نہ کسی میں یہ جرأت ہے کہ سرِ راہ کسی عورت سے چھیڑ چھاڑ کرے۔ یا اُس کے ساتھ بیہودہ برتاؤ کرے۔ ہاں شہر بہت گندہ ہے مکانات تنگ و تاریک ہیں۔ گلیاں اور سڑکیں چھوٹی ہیں۔ ہوا خشک اور گرم ہے۔ یہاں کے باشندوں کا رنگ گندم گوں اور سیاہ ہے۔"

ملتان کی تاریخ انقلاب اور تغیّر کی تاریخ ہے۔ یہاں کی سرزمین نے بہت سی تبدیلیاں دیکھیں۔ یہاں عرب آئے۔ یہاں قریش سرداروں نے اپنے

جاہ وجلال کا ڈنکا بجایا۔ پھر یہاں قرامطہ آئے۔ قرامطہ وہی ہیں جنھیں عرف عام میں "فرقۂ باطنیہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قرامطہ مصر کی فاطمی خلافت سے وابستہ تھے۔ اُنہوں نے ایک طرف تو یہ کیا کہ خلافت فاطمی کے داعی اور نقیب بنے، دوسری طرف داخلی پالیسی اُنہوں نے یہ رکھی کہ ملتان کا مشہور مندر ڈھا دینے کے باوجود ہندو راجاؤں اور فرماں رواؤں سے ربط ضبط قائم کیا۔ حتّٰی کہ مُسلم فرماں رواؤں کے خلاف یہ ہندو راجاؤں کو اُکساتے اور اُن کی مدد کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ محمود غزنوی کو انہی کے استیصال کے لئے ملتان آنا پڑا۔ اُس نے ملتان کو فتح کر لیا۔ قرامطہ نے اس کا سخت مقابلہ کیا۔ لیکن ہارے۔ محمود نے ان لوگوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔ ان کے سردار داؤد کو گرفتار کر کے غزنہ لے گیا۔ جہاں قید کی حالت میں اُس کا انتقال ہوا۔

لیکن اِن انقلابات نے بھی ملتان کی زرخیزی اور سرسبزی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ ایک مشہور سیاح اور جغرافیہ داں اپنے تاثرات سفر کے سلسلہ میں لکھتا ہے۔ "ملتان وسیع شہر ہے۔ جہاں ہر قسم کی اجناس بکثرت ملتی ہیں۔ سرکاری محاصل کم ہیں۔ لوگ عموماً خوش حال ہیں۔ مضافات شہر میں ایک ندی سے آب پاشی کی جاتی ہے۔ جو ہران میں جا ملی ہے۔ شہر میں ایک قلعہ موجود ہے۔ جندور کی چھاؤنی میں بہت سے قلعے ہیں۔ ان سب قلعوں میں نہر کا پانی پہنچایا گیا ہے۔ ملتان کا امیر تعطیل کا زمانہ اور بہار کا موسم یہیں گزارتا ہے۔

تاریخ نے پھر اپنا ورق اُلٹا۔ اب یہاں سُلطان شہاب الدین غوری کی فوجیں نظر آ رہی ہیں۔ اُس وقت یہاں سومرہ خاندان برسرِ اقتدار تھا۔ شہاب الدین غوری نے ایک قرامطی کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کیا۔ پھر اُس کا ایک غلام ناصر الدین قباچہ پرچمِ کشورکشائی لہراتا ہوا آیا۔ اور ملتان پر قابض ہوگیا۔ پھر علاء الدین بلبن کا ڈنکا یہاں بجا۔ بلبن کے ہونہار اور بہادر بیٹے محمد کا مستقر ایک عرصہ تک ملتان ہی رہا۔ پھر جب فتنۂ مغول اُٹھا اور تاتاریوں کی یورش شروع ہوئی، شاہزادہ محمد شہید ہوگیا۔ امیر خسروؒ نے اس کا دردانگیز مرثیہ لکھا۔

مہر و مہ بر روئے آں فرخ لقا بگریستند
روز و شب ہر سال آں اندک بقا بگریستند
خلقِ ملتاں مرد و زن مویہ کناں و سوگناں
کُو بہ کُو و سُو بہ سُو و جا بہ جا بگریستند
از خروشِ گریہ و بانگِ دہل شب کس نہ خفت
بسکہ در ہر خانۂ اہلِ عزا بگریستند

شہزادہ محمد یہیں ملتان ہی میں پیوندِ خاک ہوا۔

ملتان صرف سیاسی اعتبار ہی سے ہمیشہ معزز اور ممتاز نہیں رہا۔ علمی اور رُوحانی اعتبار سے بھی اس کا فیض عام رہا۔

ملتان میں بڑے بڑے مدرسے شاہانِ اسلام کی امداد و اعانت سے جاری ہوئے۔ جن پر بہت کافی رقم خرچ کی جاتی تھی۔ اور دُور دُور سے

شائقین علم آتے اور کسب فیض کرتے تھے۔

اکبری عہد کے شیخ الاسلام مخدوم الملک مولانا عبداللہ کا خاندان بھی دراصل ملتانی تھا۔

حضرت بہاءالدین زکریا کے روحانی کمالات کی روشنی بھی ملتان ہی سے دنیا کے بام و در تک پہنچی۔ اور اس نے خاک دانِ ہند کو منور کر دیا۔

ملتان نے عربی زبان کے مشہور اور مستند شعرا بھی پیدا کئے۔ ہارون بن عبداللہ ملتانی یہیں پیدا ہوئے۔ یہیں بڑھے، یہیں پروان چڑھے۔ یہ بنی ازد کے موالی میں سے تھے۔ ان کے اشعار تاریخی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ابو دلف نے اپنے سفرنامہ میں ان کا اور ان کی شاعری کا ذکر کیا ہے۔ اور اُن کے ملتانی ہونے کی تصدیق کی ہے۔

جس طرح مغلوں کے عہد میں ایران سے باکمال اور نازک خیال شعراء اور اہل علم آیا کرتے تھے۔ اُسی طرح دربار ملتان کی قدردانی، عرب شعرا اور اہل کمال کو کھینچ بلاتی تھی۔

عرب کا مشہور شاعر بحتری جس کا پورا نام ابوعبادہ ولید بن عبید البحتری ہے۔ ۲۸۴ھ میں ملتان آیا اور یہاں کافی عرصہ تک قیام کیا۔ بحتری مشہور عرب شاعر ابو تمام کا ہم عصر تھا۔

ملتان نے لسانی اعتبار سے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی تھی، یہاں کے لوگ ملتانی اور سندھی کے علاوہ عربی بے تکلف بول لیتے تھے ۳۷۵ھ میں جب بشاری مقدسی یہاں آئے تو فارسی کا چلن بھی یہاں شروع ہو چکا تھا۔

عربوں کے دورِ حکومت میں ملتان، تمدنی اعتبار سے روز افزوں ترقی کر رہا تھا۔

حجاج بن یوسف ثقفی بصرہ میں یا واسط میں رہتا تھا۔ محمد بن قاسم کبھی اروڑ میں کبھی ملتان میں، ملتان اور بصرہ کی مسافت چودہ سو میل سے کچھ زیادہ ہے مگر ایک ہفتہ میں حجاج کا خط محمد بن قاسم کو، اور اس کا خط حجاج کو مل جاتا تھا۔ گویا ڈاکیہ، تیز رفتار گھوڑوں پر دو سو میل روز کا سفر کرتا تھا۔

کاشت اور زراعت کے اعتبار سے بھی ملتان کو عہد اسلامی میں بہت ترقی ہوئی۔ یہاں ناریل، کیلا اور کھجور کے بہت سے باغات تھے۔

تجارتی اور کاروباری اعتبار سے بھی ملتان نے بہت عروج حاصل کر لیا تھا۔ بشاری مقدسی نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے "ملتان عرب تاجروں کی آخری منڈی ہے۔ یہ شہر منصورہ سے زیادہ آباد ہے۔ بہت زرخیز ہے۔ تجارتی کاروبار میں یہاں کے لوگ بڑے خوش معاملہ ہیں۔ نہ جھوٹ بولتے ہیں نہ ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔ یہ بڑا آسودہ شہر ہے، یہاں کے تاجر خوش حال ہیں، تجارت کی خوب گرم بازاری ہے۔

تعمیری اعتبار سے بھی ملتان نے بڑی ترقی کر لی تھی۔ مسجدیں، قلعے، سرائیں حمام، شاہی عمارتیں، سارے شہر میں پھیلی ہوئی تھیں۔

ان ترقیوں نے ملتان کی آبادی میں بھی بہت اضافہ کر دیا تھا۔ اصطخری نے سندھ کے حالات میں لکھا ہے، ملتان کے ارد گرد ایک لاکھ بیس ہزار گاؤں آباد تھے۔

صنعت وحرفت کے اعتبار سے بھی ملتان نے بہت ترقی کرلی تھی۔ تانبے کا کام یہاں بہت اچھا ہوتا تھا۔ مختلف قسم کے برتن تیار کئے جاتے تھے۔ اور دوسرے شہروں میں منہ مانگی قیمت پر بکتے تھے۔

ہاتھی دانت کا کام بھی ملتان میں بہت اعلیٰ درجہ کا ہوا کرتا تھا۔ یہاں سے یہ مال تیار ہو کر غیر ممالک میں بکثرت جاتا تھا۔ اور گراں قیمت پر بکتا تھا۔ ہاتھی دانت کے صندوقچے، ڈبیہ، چھری، چاقو اور ہتھیاروں کے دستے عورتوں کے پہننے کی چوڑیاں، یہ سب چیزیں ملتان میں بڑی خوبی سے تیار ہوتی تھیں۔ اور دُنیا اُن کے لئے چشم براہ رہتی تھی۔